Scanned with CamScanner

کہکشاں تبسم کا پہلا شعری مجموعہ 'بھنور بنتا ہوا دریا' ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ نظم اور غزل دونوں اصناف میں وہ اپنی تخلیقی قوت کا اچھا ثبوت دے چکی ہیں —— ان دنوں ان کے صالح علمی وادبی ذوق اور وسعتِ مطالعہ نے انہیں تنقیدی جہاں کی گرفت کے لیے مہمیز کیا ہے۔

—— تحقیق وتنقید کا ایک نیا کارنامہ 'نسائی شعری آفاق' کے نام سے اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ زیرِ اشاعت مسودہ میں انہوں نے کل اکیاون شاعراتِ اردو کی غزلیات کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اکثر مضامین میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ تلاش وجستجو ان کی خوب صورت عادت ہے اور ایک نئی جہت میں اڑان کا شوق بھی انہیں ہے۔ شاید یہی وہ جواز ہے کہ ان کی تحریر میں فکرو اسلوب کی تازگی ہے۔ اگر وہ اسی طرح لکھتی رہیں تو آنے والے کل میں ان کا نام بڑی خاموشی کے ساتھ جہانِ تنقید میں ان کے مثبت نقوش بنالے گا۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ کہکشاں تبسم تنقید کے گلشنِ ناآفریدہ کی ایک نغمہ سنج عندلیب ہیں۔

ڈاکٹر قمر جہاں

Scanned with CamScanner

نسائی شعری آفاق

کہکشاں تبسم

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

rekhta

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب کا نام : نسائی شعری آفاق
(تنقیدی و تاثراتی مضامین)
مصنف و ناشر : کہکشاں تبسم
موبائل نمبر : +919431057786,+918651449489
ای میل : kahkashantabassum26@gmail.com
تعداد : ۵۰۰
سنہ اشاعت : ۲۰۱۵ء
قیمت : ۳۰۰ روپے
کمپوزنگ : کہکشاں تبسم
مطبع : تاج آفسیٹ پریس، پٹنہ - ۴

رابطہ :
Kahkashan Tabassum
C/o Syed Zeyaul Islam,
Dpt. of Urdu, Sabaur College,
Sabaur,Bhagalpur-813210

"یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ زبان اردو
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے"

ملنے کے پتے
کتاب منزل، ما نار پور چوک، بھاگلپور۔۸۱۳۲۱۰
بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴
شمسی بک ڈپو، اسٹیشن روڈ، سمستی پور۔۸۴۸۱۰۱

Scanned with CamScanner

انتساب

ان گم نام روحوں کے نام——

جنہوں نے اپنی لوریوں اور گیتوں سے زندگی کو آہنگ بخشا
لیکن تہذیبی جبر کے باعث بے دستخط رہیں
اور تاریخی جبر نے انہیں بے شناخت رکھا۔

Scanned with CamScanner

فہرست

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

●●

Scanned with CamScanner

دردِ مشترک کی رو

سوچتی ہوں کہ دنیا میں انسانوں کے درمیان قصے، کہانیوں اور گیتوں کا جنم کیسے ہوا ہوگا؟ خیال آتا ہے کہ جب قدیم انسان دن بھر جنگلوں میں شکار کی تلاش اور حصول رزق میں وقت گزار کر تھکا ماندا اپنی آرام گاہ پر لوٹتا ہوگا تو جنگلوں کا پراسرار تحیر اور تجسس بھی تھکن کی گرد میں لپٹا اس کے ساتھ ساتھ لوٹتا ہوگا۔ اور پھر وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کے درمیان دن بھر کے واقعات اور تجربوں کو بیان کرتا ہوگا تو شاید یہیں سے قصہ گوئی کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ اسی طرح شاید ہزاروں سال پہلے کے انسانوں نے بھنوروں کی نقالی کرتے ہوئے گنگنانا سیکھا ہوگا اور رفتہ رفتہ اس سُر یالے میں اپنے بول بھی شامل کیے ہوں گے۔ غالباً اسی طرح گیتوں کی بنیاد بھی پڑی ہوگی۔ پھر یہ روایت سینہ بہ سینہ سفر کرتی پتھر کی چٹانوں، کچی دیواروں، درختوں کے پتوں اور جانوروں کے کھالوں پر نقش ہوتی ہوئی کاغذ کے اوراق تک آ پہنچی ہوگی اور اس طرح شعر و ادب کے صحیفے وجود پانے لگے ہوں گے۔ مگر کاغذی پیراہنوں میں قید ہونے کے باوجود حکایتوں، قصوں اور گیتوں کا سلسلہ زبانوں پر بھی سفر کرتا رہا کہ ہر کوئی ان اوراق کو پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس طرح اساطیری، دیومالائی اور مذہبی قصے گھر، آنگن اور چوپالوں کی رونق بنتے رہے اور ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہے۔ عام طور پر گھروں میں مائیں اپنے بچوں کو سلانے کے لئے لوریاں گاتیں اور بڑی بوڑھیوں کے ذریعے بچوں کے سونے سے پہلے قصہ سنانے کا چلن رائج ہوا۔ کہانیوں میں راجا رانی، شہزادہ شہزادی، کٹنیاں، جوگنیں، جادوگر، جادوگرنیاں دیو، پریاں اور چڑیلیں مخصوص کردار ہوتے تھے۔ خیر وشر کی معرکہ آرائی اور حسن و عشق کی وارداتوں سے بھرپور یہ قصے نہ صرف نونہالوں میں نیکی

Scanned with CamScanner

اور بدی کی تمیز پیدا کرتے تھے بلکہ تحیر اور تجسس کے احساس کو بھی ترقی دیتے ان کے تخیّل کو شاداب کرتے تھے۔ مصیبتوں اور مسائل سے جوجھنے کا سبق بھی ان ہی قصوں، حکایتوں سے ملتا تھا۔ عہدِ ماضی کی خواتین کے شاداب تخیّل کی ایک بڑی مثال گڈے گڑیاں ہیں۔ جہاں محض کپڑوں کے ننھے منے چیتھڑوں سے گڈا شہزادہ اور گڑیا شہزادی کے پیکروں میں ڈھل جاتے۔ کالی دھجیوں سے بھوت اور چڑیلوں کی صورت گری ہو جاتی۔ پھر منگنی اور شادی بیاہ کی رسمیں، خانہ داری کے امور غرض ان چیزوں کے سہارے بچیوں کی ذہنی تربیت ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ہی خیال کی ایک دھنک رنگ دنیا بھی وجود میں آ جاتی تھی۔ راتوں میں نیند کے جھونکوں سے بند ہوتی آنکھوں میں بھی یہی دنیا جگمگاتی تھی۔ سوچتی ہوں کہ ایسے تحیر آمیز، تجسس سے بھرپور اور حسن و عشق کے لطیف رنگوں سے شرابور تجربوں کے احساس سے اپنے نوخیز دنوں میں ہماری بڑی بوڑھیاں بھی تو گزری ہوں گی؟ جن احساسات سے ان کی کہانیاں سننے والے دوچار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سارے خواب بنتے مظاہر، تو انہیں زرخیز ذہنوں کا کمال رہے ہیں جنہیں مرد اساس معاشرہ ناقص العقل اور پاؤں کی جوتی سمجھتا تھا۔ تاریخ کے اوراق بھی ان کے لیے بنجر زمین بنے ہوئے تھے۔ اور شاید اسی معاشرتی اور تہذیبی جبر نے ان کی نا آسودہ خواہشوں کو لاشعور کے گہرے اندھیرے میں ڈال رکھا تھا۔ جو اپنے خوابوں اور تقاضوں کو نئی صورت میں اپنی نسل پر ظاہر ہو رہی تھیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ عورتوں سے گفتگو یا عورتوں کی گفتگو کے لیے ہماری ادبی تہذیب نے غزل کی صنف کو فروغ دیا کہ سات پردوں میں چھپا کے رکھی گئی اس مخلوق کی باتیں بھی رمز اور اشارے میں ہی کی جائیں۔ لیکن باوجود احتیاط کے اپنے جمالیاتی احساس سے مجبور شعرأ نے نسائی شخصیت کی سراپا نگاری میں ہزاروں دیوان لکھ ڈالے۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ رسمِ پردہ دری ایسی ہے تو بے پردگی کسے کہیں گے؟ گھنگھریالے زلفوں، قندھاری انار سے رخساروں، گلاب سے لبوں، غزالی آنکھوں، سارس جیسی گردن، چیتے جیسی کمر، چاندی جبینوں، میدہ شہاب اور سونے سی دمکتی رنگت، کوئل سی آواز، آبشاروں کا سا ترنم، یہاں تک کہ دل کی دھڑکنوں کی لئے پر کانوں کے

Scanned with CamScanner

ملتے زیور کا جو ذکر اردو شاعری میں قدم قدم پر ملتا ہے، اس پر حجاب کی کون سی پرت پڑی ہوتی ہے؟ ہاں شعرا کا خیال کبھی آئینہ پیشانیوں کے پیچھے اور ابرِ سیاہ سی زلفوں سے ڈھکے غور وفکر کرنے والے دماغ کی جانب نہیں گیا۔ شاید رسمِ پردہ داری اسی نسائی ذہن اور شعور کے لیے تھی کہ ان کی جھلکیاں بھی دنیا نہ دیکھ پائے۔ ورنہ عورت تو اردو شاعری میں سوتی، جاگتی اور چلتی پھرتی صورتوں میں موجود ہی تھی، بس روح سے خالی تھی۔ جسے ہر تخلیق کار اپنے اپنے طور تراش رہا تھا اور الگ الگ رنگوں سے سجا سنوار رہا تھا اور اپنی لذتیت پرستی کی تسکین کر رہا تھا۔

جب حنائی انگلیوں نے قلم اور کاغذ سے دوستی گانٹھی اور اپنے جذبوں کا اظہار شعر گوئی کے بہانے کرنا شروع کیا تو تہذیبی جبر نے ان کے وجود کی حرمت پر ہی سوال کھڑے کرنے کا کام شروع کیا اور تاریخی جبر نے اسے اوراق میں درج کرنے سے پلہ جھاڑ لیا۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں کچھ تذکرہ نویسوں نے ان کے نام اور کلام کو محفوظ کرنے کی کوشش تو کی لیکن بیش تر خواتین کے سخن کی معراج حمد، نعت، مناجات اور منقبت وغیرہ ہی رہی۔ کیوں کہ عورتوں کی دولت و سلطنت فقط مصلیٰ اور تسبیح تھی کہ بے در و دریچہ اور بے روزن کوٹھری میں رہنے والی ناقص العقل قوم کے لئے تو بس رہے نام اللہ کا۔ بھلا شعور و آگہی سے بے بہرہ اس قوم کو جمالیات کی فہم کیا؟ ہاں فہم و فراست، ذہانت و فطانت سے معمور تہذیب کا دھنک رنگ استعارہ تو وہ مخلوق تھی جس کی چوکھٹوں اور دہلیزوں کے پار راج کنوروں اور نواب زادوں کو مہذب بننے کے مرحلے طئے کرنے ہوتے تھے۔ کہ وہ علاقے ان کی آن بان اور شان میں اضافہ کا سبب تھے۔ یوں شعر گوئی اسی کا فن اور حق ٹھہرائی گئی تھی اور زنان خانوں میں حرف و آگہی کے چراغ جلانے پر پابندی تھی۔

شعر و ادب کی تخلیق خاتونِ خانہ کے لئے شجرِ ممنوعہ تھی کہ یہ ابن آدم کی دسترس میں ہی تھا لیکن بنتِ حوا نے نہ صرف اس ممنوعہ علاقے میں جانے کی ہمت کی بلکہ اسے اپنی سیر گاہ بنا لیا۔ مرد اساس تہذیب کے جبر نے اسے زن بازاری کا شیوہ قرار دیا اور خاتون خانہ کے لئے شعر گوئی معتوب ٹھہرائی گئی۔ فن کی تخلیق قدرت کا عطیہ ہے تو پھر دو، ہم صنفوں میں اظہار کی سطح پر تفریق کیوں؟ جب

Scanned with CamScanner

کہ دونوں کے یہاں مردانہ روایت کی تقلید جگ ظاہر تھی۔ اور دونوں کے جذبہ وخیال ایک جیسے تھے۔ مرد اساس معاشرے کی نفسیات کی ایک بڑی مثال ریختی ہے۔ جس کی ایجاد کے پسِ پردہ عورتوں کی تضحیک کا پہلو ہی تھا۔ باوجود شعراؑ کی تلذذ پرستی کے اس کا ایک نمایاں کام یہ رہا کہ اس نے اس عہد کے لکھنؤ کے درونِ خانہ حالات کو آئینہ کر دیا۔ اس صنف کا دوسرا وصف یہ ہے کہ اس نے عورتوں کی کیفیات، نفسیات، اصطلاحات، محاورات اور روزمرہ کو اردو زبان کی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ تیسرا وصف یہ ہے کہ وقتی طور ہی سہی اردو غزل کو فارسیت کے غلبے سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی۔ لیکن اس طرح کی شعر گوئی کا بنیادی مقصد تو بنتِ حوا کی تضحیک کرنا ہی تھا۔

تذکروں کے حوالے سے شاعرات کے جو نمونۂ کلام ملتے ہیں وہ واضح طور پر موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے شعراؑ کی روایت کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ شاعرات نے خود کے لئے تذکیر کا ہی صیغہ استعمال کیا ہے۔ گویا فنی اور فکری دونوں اعتبار سے روایت کی تقلید ہوتی رہی۔ لیکن کہیں کہیں اس روایتی طرز میں نسائی فکر کی کرنیں کوندجاتی ہیں جس سے ان کے شعور کی بے داری کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً:

گل کے ہونے کی توقع پہ جئے بیٹھی ہے
ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے

●

میں ہوں وہ تنگِ خلق کہ کہتی ہے مجھ کو خاک
اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

●

پہلے شعر میں کلی صنفِ نازک کی علامت ہے۔ جس میں تکمیلیت کے خواب کے ساتھ وجود کے ادھورے پن کا دکھ پنہاں ہے۔ یہ شعر اپنے عہد کے معاشرے اور تہذیب کا آئینہ ہے۔ جس میں عورت صرف ایک شئے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ شعر مہ لقا بائی چنداؔ کا ہے۔ دوسرے شعر میں

Scanned with CamScanner

تنگِ خلق کا لفظ نسائی وجود کے لئے ہے جہاں خاک بھی شکوہ کر رہی ہے کہ اس صنف کو میری مٹی سے گھڑ کے مجھے پامال کیا گیا۔ مذکورہ شعر ضیائی بیگم ضیا کا ہے۔ دونوں ہی اشعار نسائی تفکر کے ترجمان ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی شاعرات کے یہاں بھی نسائی فکر و شعور موجود تھا۔ بھلے ہی سماجی اور تہذیبی جکڑ بندی کے سبب یہ رنگ ابھر اور نکھر کر سامنے نہیں آ سکا لیکن نسائی فکر کی اڑانیں اپنے افلاک کی تلاش میں پنکھ تو کھول رہی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں عورتوں کی سماجی، معاشرتی، علمی اور تہذیبی صورتِ حال کے پیشِ نظر کچھ تحریکیں وجود میں آئیں جن کا مقصد تعلیمی لیاقت کے ساتھ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشنا تھا۔ مثلاً راجا رام موہن رائے کی ستی پرتھا کے خلاف سماجی تحریک، ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی ناول اور تہذیبِ نسواں جیسے رسالے، شیخ عبداللہ کے ذریعہ علی گڑھ میں گرلز اسکول کا قیام وغیرہ۔ رفتہ رفتہ ان تحریکات کے زیرِ اثر فرسودہ اور دقیانوسی روایت کے دائرے ٹوٹنے لگے۔ عورتوں نے بھی اپنے فکر و شعور کی دنیا کو شعر و ادب کا حصہ بنانا شروع کیا۔ اور پھر حاشئے پر رکھی جانے والی یہ قوم اپنے جذبات و احساسات، صنفی مسائل اور فکری روئے سمیت اردو شعر و ادب کے کارواں میں بڑے وقار اور حوصلے کے ساتھ شریک ہونے لگی۔ فطری طور پر ان شاعرات نے قدیم شعری روایت کی تقلید کی۔ کیوں کہ تخلیقی وفور کے باوجود ان کے تجربات کی دنیا محدود تھی۔ اس لیے ابتدائی شاعرات کے یہاں روایت سے استفادہ کرنے کا عمل نمایاں ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ان کا شعری رویہ تقلید سے توسیع اور توسیع سے تجدید کی منزلوں سے گزرتا نظر آتا ہے۔ نت نئی رہ گزر اور نئے آفاق کی تلاش و جستجو میں ابھی شاعرات محوِ سفر ہیں۔

میں نے اس کتاب میں بیسویں صدی کی غزل کے حوالے سے چند شاعرات کے جذبہ و فکر کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ بہت سارے نام باقی رہ گئے ہیں جس کا ایک سبب تو مواد کی عدم فراہمی ہے اور دوسرا سبب کتاب کی طوالت بھی۔ مستقبل میں اگر مزید شاعرات کے مجموعۂ کلام کا حصول ممکن ہوا تو اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش ضرور ہوگی۔

●●

Scanned with CamScanner

rekhta

۸۶

راضیہ خاتون جمیلؔہ

راضیہ خاتون جمیلؔہ کی ولادت ۱۸۶۱ء میں کلکتہ کے ایک علمی اور مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ یہ پٹنا کے خان بہادر شمس العلماً مولوی کبیر الدین کی بیٹی اور خان بہادر خدا بخش خاں بانی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی اہلیہ تھیں۔ شرفِ تلمذ شادؔ عظیم آبادی سے حاصل تھا۔ ان کے آٹھ دواوین مخطوطات کی صورت خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں۔ جن میں دو دیوان کو شفیع مشہدی نے مرتب کر کے ۲۰۰۴ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری' پٹنہ سے شائع کروایا۔

جمیلؔہ کی غزلیں تغزل کے رنگ سے بھر پور ہیں۔ ان میں ایک طرف عشقِ مجازی کی رعنائیاں ہیں تو دوسری جانب عشقِ حقیقی جلوہ گر ہے۔ دونوں رنگوں کی خوب صورت آمیزش سے ان کی غزلوں کا کینوس بہار آشنا ہو رہا ہے۔ لب ولہجہ درد و سوز سے معمور ہے جس کی اثر انگیزی دل کو چھو جاتی ہے۔ کہیں کہیں استاد شادؔ عظیم آبادی کا شاعرانہ آہنگ بھی جھلک مارتا نظر آتا ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے جمیلؔہ کے شاعرانہ تیور کمال کے ہیں جس سے ان کے جمالیاتی شعور کی پختگی اور قدیم شعری روایت پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے محض تفننِ طبع کی خاطر شاعری نہیں کی بلکہ اپنے احساس و کیفیات کی ترجمانی کے لیے اسے اپنا ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ مترنم لفظوں اور رواں بحروں میں جذبات کو تہہ نشیں کرنے کا ہنر ان اشعار میں پنہاں ہے۔ دیکھئے :

لوگ کہتے ہیں کوئی بچہ ہے
دل جو روتا ہوا نکلتا ہے

Scanned with CamScanner

نالہ و شیون و فغاں کے سوا
دلِ عاشق سے کیا نکلتا ہے
اے جمیلہ بنو برہمن تم
بت کے دل سے خدا نکلتا ہے

●

دل پہ ہوتا جو اختیار اپنا
یوں نہ جی ہوتا بے قرار اپنا
لے چلا ہے کہاں تو جوش جنوں
مجھ سے چھٹ جائے گا دیار اپنا

●

خواہش زیست کو ہم نے ہمہ تن چھوڑ دیا
روح نے تیری تجسس میں وطن چھوڑ دیا
منزل گور سے جانا ہے مجھے سوئے عدم
تا سبک سار رہوں بار کفن چھوڑ دیا

●

نہ ہجر میں مجھے پر آب دیدہ ہونا تھا
کیا تھا عشق تو پھر برگزیدہ ہونا تھا
اسی نے عشق کو تیرے جہاں میں فاش کیا
تجھے نہ قیس گریباں دریدہ ہونا تھا

●

زلف سے پوچھو پریشانی مری
اور آئینہ سے حیرانی مری

●

ہو گئی اس پر توجہ غوث کی
جو چمکتی ہے یہ پیشانی مری

●

Scanned with CamScanner

وعدوں پہ اس کے مجھ سے توکل نہ ہو سکا
افسوس دو گھڑی بھی تحمل نہ ہو سکا

●

میں برہمن ہوں خلد ہے میرا یہ بت کدہ
واعظ تمہارے واسطے جنت ہے حور ہے

●

برہمن مجھ کو بنا کر دل ہوا با خدا
مجھ کو ہندو کر دیا اور خود مسلماں ہو گیا

●

اس گھڑی کوچۂ دلدار سے تو آتی ہے
تیرے دامن سے صبا پیار کی بو آتی ہے

●

اے صبا بہر خدایاں سے اڑا نا نہ اسے
پائمالی کو زمیں پر تو مری خاک رہے

●

دل وہ بلبل کہ کنارہ جسے گلزار سے تھا
اک فقط کام اسے کوچۂ دلدار سے تھا

●

شاید ٹھہر گیا ہے حرفِ شکایت آ کر
جو آبلہ تھا اس دم میری زبان پر ہے

●

خنجر جو اپنے ہاتھ میں ہوتا تو اس گھڑی
پہلو کو چیر کر تجھے اے دل نکالتے

●

جیسا کہ ابتدائی شاعراتِ اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے روایت کی محض تقلید کی ہے۔ لیکن جمیلہ کی غزلوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہیں اپنے عہد کی زبان میں

Scanned with CamScanner

اپنی ذاتی کیفیات و خیالات کو پیش کرنے کا ملکہ حاصل رہا ہے۔ کیوں کہ حرفِ شکایت کا آبلوں کی صورت ہونا، جسم کو روح کا وطن کہنا، ہندوستانی ہونے کے فخر میں بت کدہ کو خلد ماننا ،ہجر میں آنسو بہانے والے عشق کو برگزیدہ نہیں جاننا، بت کے دل میں خدا کا ہونا جیسے مضامین ان کے بلند پروازیٔ تخیل کی شناخت ہیں۔ عام طور پر شعرأ نے گور کو ہی آخری منزل مانا ہے مگر جمیلہ کے تخیئل کی توانائی دیکھئے کہ ان کی چاہت وہاں سے بھی آگے یعنی سوئے عدم کو منزل بنانے کی ہے۔ جنون اور بے قراری کے جذبات کے بیان کے لیے سادگئ زبان کی یہ کرشمہ سازی قابل غور ہے کہ 'افسوس دو گھڑی بھی تحمل نہ ہو سکا، اور 'دل وہ بلبل کہ کنارہ جسے گلزار سے تھا'۔ لفظ 'کنارہ' سے مراد مطلب نہیں ہونا یا بے نیاز ہونا ہے جس سے ان کی جادو بیانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خود کو برہمن کہنے کا سبب ہندوستانی جمالیات کی کارفرمائی بھی ہو سکتی ہے ۔ بت کدہ ہندوستان بھی ہو سکتا ہے اور ان کا گھر بھی کہ ہر عورت کے لیے اس کا گھر ہی اس کی جنت ہے۔ کوچۂ دلدار سے صبا کے ساتھ پیار کی بو کا آنا بھی الگ رمز رکھتا ہے۔ بہر کیف ابتدائی شاعرات کے کارواں میں راضیہ خاتون جمیلہ کا نام اپنے خیال وفکر کی تازگی اور زبان دانی کے باوصف قادرالکلام شاعرہ کی حیثیت سے روشن رہے گا۔

●●

Scanned with CamScanner

نثار فاطمہ کبریٰ

نثار فاطمہ کبریٰ مشہور قانون داں اور رئیس عظیم آباد مولوی محمد یحییٰ اور اردو کی پہلی خاتون ناول نگار رشید النساءؔ کی منجھلی بیٹی تھیں۔ وہ چیف جسٹس شمس العلماءؔ خان بہادر مولوی سید وحید الدین صاحب کی نواسی اور مصنفِ کاشف الحقائق امداد امام آثر کی سگی بھانجی تھیں۔ علمی اور ادبی ذوق شفیق اور باشعور ماں کی پرورش اور صحبت کا نتیجہ تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ شروعات مناجات کے اشعار سے ہوئی جس پر شاد عظیم آبادی نے نہ صرف اصلاح دی بلکہ یہ بھی کہا کہ 'شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ عورتوں میں بھی یہ مادہ ہے مگر افسوس ہے کہ علم کی کمی ہے'۔ اول اول تو خوب نظموں میں طبع آزمائی کی جن میں محلے والے، دائی اور کنیزوں کو موضوع بنا کر ہجو یہ انداز میں اپنے تاثرات پیش کرتیں۔ مثلاً مثنویٔ انجمن، تاڑی نامہ، احمق نامہ اور آئینہ نامہ جیسی چیزیں وجود میں آئیں کہ گھر سے باہر تک لوگوں کی زبان پر جس کا کوئی نہ کوئی بند چڑھ ہی گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر بڑے بھائی غلام مولا نے اپنی شدید ناراضگی کا اظہار تو کیا ہی کہ لڑکیوں کی تعلیم کا مقصد مرزا سودا بن جانا نہیں ہے اور ساتھ ساتھ وہ کاپی بھی پھاڑ دی جس پر یہ نظمیں مسکرا رہی تھیں۔ پدری معاشرے کی جانب سے یہ ردِ عمل ایک باذوق اور باصلاحیت خاتون پر کاری ضرب تھا کہ اس کے فکر وخیال مرد اساس تہذیب کے تابع رہیں۔ ایسی باصلاحیت شاعرہ جس کی شاد عظیم آبادی اصلاح سخن کریں اور عبدالغفور شہباز جیسی شخصیت جس کی سلاستِ زبان کی داد دیں اس کے پنکھ کترنے کو بھائی کے عتاب قینچی تیار تھی۔ ایک ایسے وقت میں جب ملک میں سماجی، اصلاحی، سیاسی اور علمی تحریکات کا زور اپنے شباب پر تھا مگر چہار دیواروں اور چوکھٹوں کے اندر اس تازہ ہوا کے آنے پر پابندی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کبریٰ کی ماں

Scanned with CamScanner

پہلی خاتون ناول نگار ہوتے ہوئے بھی پردۂ خفا میں رہیں اور جب ان کا بیٹا قانون پڑھ کر لندن سے گھر لوٹا تو اس نے اپنی ماں کی کتاب 'اصلاح النسأ' تکمیل کے گیارہ برس بعد ۱۸۹۴ء میں شائع کروائی۔ اس کتاب پر بھی رشید النسا کے نام کے بجائے 'والدہ بیرسٹر سلیمان بارایٹ لا' چھپا تھا۔ اسی گھٹن بھرے ماحول میں کبریٰ کا ذوق و شوق پروان چڑھتا رہا۔ ۱۹۰۶ء میں ان کی ماں اور چند ہندو خواتین کی کوششوں سے بیتیا ہاؤس گرلز اسکول قائم ہوا جس کے سالانہ جلسے میں کبریٰ نے مہارانی بیتیا اور بادشاہ نواب رضوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ایک نظم سنائی جس میں ہندوستانی عورتوں کے کرب و مسائل کو موضوع شعر بنایا گیا تھا جو شاعرہ کے گہرے سماجی اور تہذیبی شعور کی گواہ ہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'خیالاتِ کبریٰ' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ چند اشعار جو ان کی بالیدہ فکر اور جمالیاتی روئے کے مظہر ہیں، دیکھئے :

●

نشانِ منزل سے بے خبر ہیں اور کارواں سے جدا ہوئے ہیں
نظر تو آتی ہیں لاکھ راہیں مگر کوئی راہ بر نہیں ہے

●

اگر وہ دوست صادق ہے تو شکوہ سن نہیں سکتا
حمایت شکوہ بے جا کی کسی نامہرباں تک ہے
مصیبت اور راحت ہیں رفیقِ زندگی کبریٰ
رہائی ان رفیقوں سے نہیں عمر رواں تک ہے

●

نہ باز تم اپنی ہاں کہتے کہتے
مگر تھک گئی یہ زباں کہتے کہتے
کسی کی نہ دیکھی کبھی مہر بانی
زباں تھک گئی مہرباں کہتے کہتے

Scanned with CamScanner

ابھرتی گئیں طعن و تشنہ سے قومیں
نشاں بن گیا بے نشاں کہتے
اسی طرح آیا ہے راہِ عمل پر
جہاں کا ہر اک کارواں کہتے کہتے

●

سچائی اور عدالت و شجاعت سینہ زن جب ہوں
نہ کیوں پھر وقت پر نازک سے نازک سینہ تن جائے
خریدیں ملک کی چیزیں اور جامہ تن پہ سادہ ہو
تو کیوں جاپان و یورپ میں کسی کا مال و دھن جائے

●

عمر گزری وہ اک فسانہ ہے
جو سمجھنے کو تازیانہ ہے
کیا کہیں حال دل نشیں اپنا
فکرِ دنیا کا وہ خزانہ ہے

●

نہ پہنچی اسے گرمئی آفتاب
جلانے کو ہر ذرہ تیار ہے

●

محبت کیا؟ حکومت دل پہ زنجیر سلاسل کی
شکایت کیجیے کس سے جنوں انگیزیٔ دل کی
وفورِ شوق میں کب تھی تمیز مشکل و آساں
جنابِ عشق نے آساں مری ہر ایک مشکل کی

Scanned with CamScanner

خبردار اے نثارؔ ان سے نہ کہنا راز الفت کا
کہ ناکامی سزا ہے انکشافِ حالتِ دل کی

●

نثار فاطمہ کبریٰ کی شادی شاہ آباد، بہار کے ایک مشہور و معروف عالم فاضل خاندان میں سید رضا کریم سے ہوئی جن کے والد مولانا سید عمر کریم اپنے زمانے کے مشہور حنفی عالم تھے۔ سسرال کا ماحول بھی درون خانہ اسی روایتی جہل اور عورتوں کی تعلیم کا مخالف تھا جیسا کہ ان کے میکہ کا رہا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں اپنے خسر مولانا عمر کریم کی وفات کے بعد ہی انہیں اطمینان سے پڑھنے لکھنے کی آزادی نصیب ہوئی۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس خاندان میں شمس العلماءؔ، اور خان بہادر جیسی شخصیتیں ہوں، جہاں نانا اور والد قانون داں ہوں اس گھرانے میں بھی تعلیم نسواں کا تصور فقط نماز، تلاوتِ قرآن اور نور نامہ تک ہی رہا ہے۔ پتا نہیں کیسی کیسی صلاحیتیں اس تہذیبی جبر کی سولی پر لٹک چکی ہیں کیوں کہ تاریخ اس کی خبر دینے سے قاصر ہے کہ مؤرخ کی انگلیاں اور قلم دونوں اسی معاشرے کے نمائندہ تھے۔

●●

Scanned with CamScanner

ز۔خ۔ش

زاہدہ خاتون شروانیہ کی ولادت ۱۸۹۴ء میں بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں ہوئی۔ان کے والد نواب مزمل اللہ خاں شروانی بھیکم پور کے جاگیر دار تھے۔زاہدہ کی کم عمری میں ہی ان کی والدہ حجابی بیگم کا انتقال ہوگیا تھا۔ان کے والد نے بچوں کی تعلیم وتربیت کا ذمہ ایک ایرانی معلّمہ رخشندہ خانم کو سونپا جو خود بھی فارسی کی شاعرہ تھیں۔ان کے والد نے، جو لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کے بھی حامی تھے ایسے مزید قابل اساتذہ کو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر معمور کیا جو مشرقی علوم کے ساتھ انگریزی کا بھی درس دیتے تھے۔مختلف زبانوں کے علم، کتب بینی کے شوق، رخشندہ خانم کی صحبت اور قابل معلموں بالخصوص محمد اسمٰعیل صاحب کے سبب زاہدہ خاتون کو نہ شعروادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا بلکہ شاعرانہ صلاحیتوں کو بھی جلا ملی۔اسمٰعیل صاحب نہ صرف ایک بلند مرتبہ عالم فاضل استاد بلکہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے۔جن سے زاہدہ اصلاح سخن بھی لیا کرتی تھیں۔گھر میں اپنے بھائی بہنوں اور ہم جولیوں کے ساتھ کبھی بیت بازی، کبھی طرحی مشاعرہ تو کبھی مضمون نویسی کی محفلوں کا انعقاد ہوتا اور کبھی کسی موضوع پر مباحثے ہوتے۔انہوں نے بارہ، تیرہ سال کی عمر میں 'ینگ شروانیز لیگ' نام کی ایک انجمن بھی بنائی جس کے کل آٹھ ممبر تھے۔اور اس کا ماہانہ چندا دو آنے فی کس تھا۔قومی اور ملی درد رکھنے والے یہ کم سن لوگ اس پیسے کو سماجی فلاح کے کاموں میں خرچ کیا کرتے۔غرض شاعرہ کے اندر علمی ذوق ہی نہیں بلکہ عملی شوق کی بھی فراوانی تھی۔وہ خود بھی شعر کہتیں اور ہم جولیوں کو بھی شعر گوئی کی ترغیب دیتی تھیں۔ان کی بڑی بہن احمدی بیگم نکہت اور بھائی احمد اللہ خاں حیراںؔ نے بھی شعروادب میں اپنی صلاحیتوں کے نقوش ثبت کیے۔

Scanned with CamScanner

انہوں نے نادر خاتون کے نام سے لکھنا شروع کیا غزلوں میں کبھی نزہت بھی تخلص کرتی تھیں۔ لیکن جب لوگوں کے اندر یہ تجسس پیدا ہوا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ تو انہوں نے نام بدل کر ز خ ش کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ زاہدہ خاتون کی نثری اور شعری تخلیقات ہم عصر رسائل میں ز خ ش کے نام شائع ہوتی تھیں۔ کیوں کہ صدیوں کے تہذیبی جبر کے سبب اشرافیہ طبقے کی عورتوں کے نام کو بھی پردہ نشین رہنا پڑتا تھا۔ ان کے گھر کا ماحول خالص اسلامی تھا اس لیے مذہب سے گہری عقیدت اور وابستگی لازمی تھی لیکن بہترین کتابوں اور رسالوں کے مطالعے کے سبب معاشرے اور ملکی حالات کی آگہی نے ان کے اندر وطن دوستی، قوم پرستی اور حریت کے شدید جذبات پیدا کر دئے تھے۔ گاندھی جی کی سودیسی تحریک سے ان کا یہ لگاؤ تھا کہ تکئے اور رضائی کے استر کھادی کے بنواتیں کیوں کہ جاگیر دار خاندان کی گاندھی جی سے اعلانیہ حمایت حکومت کی مخالفت کا اشارہ سمجھی جاتی۔ کھادی سے ان کا جذباتی لگاؤ اس قدر شدید تھا کہ ان کے کفن کی چادر ان کے ہی گاؤں میں تیار کی گئی کھادی کی تھی۔

ز خ ش حساس اور دردمند دل رکھنے والی فطری شاعرہ تھیں۔ ایک طرف انہیں خاندان اور احباب کے ساتھ پیش آنے حادثات گہرے ملال سے بھر دیتے تو دوسری طرف قوم و ملک میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات بھی دل گیر کرتے۔ جذبہ و فکر کی حساسیت کبھی نثر تو کبھی شعر میں ڈھل جاتی۔ اور وہ قفس نما گھر کی چہار دیواری کے اندر رہتے ہوئے بھی کائنات بھر کے رنج و غم کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیتیں۔ ان کی شاعری ان کی گہری بصیرت اور بالیدہ شعور کی ترجمان ہے۔ ان کے اہم موضوعات خواتین کی سماجی، اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اصلاح پر مبنی تھے۔ جن کا مقصد عالم نسواں کو انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کرانا تھا کہ ان کی جہالت اور اوہام سے گرد آلودہ روایتی منظر نامے کو بدلا جا سکے۔ تا کہ انہیں زمانے کے نشیب و فراز کی آگہی حاصل ہو اور وطن دوستی، تیاگ اور قربانی کا جذبہ بھی پیدا ہو۔ چند اشعار دیکھیں جو نسائی احتجاج کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں:

Scanned with CamScanner

کس خطا میں ہیں عورتیں ماخوذ
اے مسلمانو شرط ہے انصاف
کیوں نہ ہو خادمِ وطن عورت
کیوں معطل رہے یہ بیٹر ہاف

●

رفعتِ خوئے ملک کو ہی اڑا لو صاحب
خوش نہ ہو، حسن میں گر تجھ سے فروتر ہے پری

●

کیا ہے مطعون عورتوں کو جو تم نے گرمِ عتاب ہو کر
جواب اس کا تمہیں ملے گا سوال یومِ حساب ہو کر
یہ کیسے مانوں کہ اس میں داخل تضادِ حق مرد و زن ہے
رہی ہے زیرِ مطالعہ یاں ہمیشہ فطرت کتاب ہو کر

زخ ش کے یہ اشعار کسی تانیثی تحریک کی دین نہیں بلکہ سماج اور معاشرے میں رائج صنفی امتیاز کے المیہ کو دردمندی سے اجاگر کرتے ہیں۔ انہیں اپنی تاریخ اور قومی ورثے پر فخر تھا اور اسی جذبے کے تحت وہ قوم کو باعمل دیکھنا چاہتی تھیں۔ اپنی تہذیبی اور قومی شناخت کو نظر انداز کرنا ان کے نزدیک مسلمانوں کا عظیم خسارہ ہے۔ شاعرہ نہ صرف اردو کی طویل شعری روایت سے باخبر ہیں بلکہ اپنے عصری شعر و ادب کا بھی رچا ہوا شعور رکھتی تھیں۔ حالی کی مسدس کا گہرا اثر ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کے فکر انگیزی سے لب ریز چند اشعار پیش ہیں:

نہ رہا کچھ نشانِ قومیت
قوم کے منہ پہ کہہ رہی ہوں صاف
تکیہ کر اے قوم! حق پر تکیہ کر
شاد رکھ اے قوم دل کو شاد رکھ

Scanned with CamScanner

وہ قوم حاضر جوابیوں میں جواب تھی جو کہ آپ اپنا
سنے جو اس نے دلائلِ حق تو رہ گئی لا جواب ہو کر

●

سمجھو ادائے فرض میں شاہ و گدا کو ایک
دیکھو کیا نہ گور نے بہرام کا لحاظ
تھوڑا بہت ضمیر کا بھی پاس چاہیئے
ایسا بھی کیا مخالفتِ عام کا لحاظ
اٹھتی ہوں آج رایتِ حق لے کے ہاتھ میں
دیکھوں کسے ہے عزتِ اسلام کا لحاظ

●

غور کر ان کی حکمتوں پہ شروع
ختم کر ان کی تربتوں کا طواف

●

نسلِ آئندہ کی لعنت کر قبول
ورنہ قائم عظمتِ اجداد رکھ

●

اس زمیں پر ہندو و مسلم حیاتِ ہند ہیں
زندگی چاہو تو مانگو وصلِ جان وتن کی خیر

ز خ ش کے اشعار ان کے فکری شعور کے آئینہ دار ہیں۔وطن کی محبت ،قوم کا درد اور صدیوں کی تہذیبی تاریخ کا حسن اور جلال ان کی شاعری میں منعکس ہوا ہے۔انہیں ہندوستانی عوام کے ماتھے پر غلامی ایک داغ کی صورت دکھائی دیتی تھی۔انگریزوں کی حکم رانی کے خلاف ہندوستانی لیڈروں کے احتجاج کی وہ ہم نوا تھیں۔اپنی نظموں کے ذریعہ اپنے ذہنی روئے اور فکر

Scanned with CamScanner

کو بخوبی مختلف رسائل میں پیش کر رہی تھیں۔ وہ بذاتِ خود بھی ترکی کے انور پاشا، گاندھی جی اور گوپال کرشن گوکھلے سے بہت متاثر تھیں۔ گوکھلے کی موت پر انہوں نے ایک خوب اور فکریہ نظم بھی کہی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'آئینۂ حرم' ۱۹۲۱ء میں اور دوسرا 'فردوس تخیل' ۱۹۴۱ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ عصری تقاضوں کے پیش نظر انہوں نے نظم کی صنف پر خاص توجہ دی۔ کیوں کہ اس صنف میں اپنے فکر و خیال کو واضح طور پر بیان کرنے کی آسانی تھی۔ انہوں نے نظموں کی بہ نسبت غزلیں کم کہیں لیکن ان کا فکری نسائی لہجہ اپنے عہد کی انوکھی اور پر جوش آواز ثابت ہوا۔ ان کے ہم عصر مشہور دانشور خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۱۷ء میں انہیں 'فضائل بانو' کے خطاب سے نوازا اور سید ممتاز علی مدیر 'تہذیبِ نسواں' نے ۱۹۲۰ء میں ۱۵ روپیے کا انعام رسالہ کی جانب سے عطا کیا۔ ان کی بالیدہ فکر اور بصیرت کا اندازہ ان کے سیاسی شعور سے بھی ہوتا ہے کہ جب دور دور تک ترقی پسند روئے کا کوئی کونپل نہیں پھوٹا تھا تب انہوں نے غریب اور لاچار مزدوروں کے لئے شعر کہے۔ طبقۂ اشرافیہ کی ایک نسائی شخصیت کی فکری توانائی اور دردمندی اردو معاشرے کے لیے ایک مثال ہے۔ اشعار دیکھئے :

کارخانے میں جو بارود کے بم آ کے پھٹا
جل گیا پیکرِ بے جرم و خطائے مزدور
کلبۂ برف دسمبر میں ہے سر کے اوپر
فرشِ آتش ہے مئی میں تہہِ پائے مزدور
طفل کی فکرِ شکم زن کا غمِ عریانی
شب تاریک میں ہیں خواب ربائے مزدور
شاید اے مالکِ سرمایہ نہیں تجھ کو خبر
ناظر و قادر و عادل ہے خدائے مزدور

●

Scanned with CamScanner

ان اشعار کی فکری اور لسانی جہات قابل غور ہیں۔ مزدوروں کی حمایت میں سرمایہ داروں کو للکارتی ایک نسائی آواز کی مئی اور دسمبر جیسے انگریزی لفظوں میں شاعرانہ حسن بھرتی منفرد تخلیقی قوت حیرت انگیز نہیں ؟ زخ ش وہ واحد نام ہے جس نے مارکس کے نظریۂ اشتراکیت پر مبنی ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے برسوں پہلے اپنی شاعری کے ذریعہ محکوم مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ اردو شاعرات کی تاریخ میں سیاسی فکر و شعور کی یہ پہلی مثال ہے۔ زخ ش کی شاعری ان کے اس شعر کی تفسیر ہے:

ذاتی الم گیا تو غمِ دوست آ گیا
مہماں سرائے غم دلِ زہت رہا سدا

زخ ش کو اپنے خاندانی اور تہذیبی روایتوں کی پابندیوں کا شدید احساس تھا۔ جہاں عشق اور محبت کی باتیں ممنوع تھیں۔ باوجود اس کے ان کے اشعار داخلی شخصی کیفیات واحساسات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ جو یاسیت کی دبیز تہوں میں نہاں ہیں۔ اسی سبب انہوں نے اپنے دل کو 'مہماں سرائے غم' کہا ہے:

شکوے گلے کئے نہ فغاں کی نہ آہ کی
کیوں کر اڑی خبر مرے حالِ تباہ کی

●

اے خدا اب تو ہی مالک ہے دلِ نادان کا
اس گرفتارِ بلا اس عقل کے دشمن کی خیر

حد کو پہنچی تھی محبت مری تیرے آگے
ہو گئی حد سے یہ کم بخت سوا تیرے بعد

●

امیدوں سے ہے لطفِ خطراتِ الفت
سفینوں سے ہوتی ہے ساحل کی رونق

Scanned with CamScanner

دل سے کہہ دو کہ ہوئی جاں بھی ہدف تیرِ بلا
کام آئی نہ مری جاں تیری سینہ سپری
رازداروں کے چھپائے نہ چھپا میرا جنوں
اڑ گئی ہوش کی صورت خبرِ بے خبری

●

ان اشعار میں ذاتی کیفیات پسِ پردہ عیاں نظر آتے ہیں۔ جذبوں پر نقاب ڈالنے کا عمل تہذیبی جبر کا ہی زائیدہ ہے۔ ایک حساس فن کار عصری صورتِ حال کو بھی شخصی واردات بنا کر پیش کرتا ہے۔ مگر زخ ش نے اپنے باطنی احساسات کو مذہب، ملک اور قوم کے درد میں اس طرح پرودیا ہے کہ رومان پرور جذبوں کی شناخت دشوار ہو جاتی ہے۔

زخ ش کا شعری ڈکشن اپنے عصر کا عکاس ہے۔ فارسی اور عربی لفظیات کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی اردو زبان اور اس کے محاورے اور کہیں کہیں انگریزی کے الفاظ ان کے اشعار کی زینت ہیں۔ روزمرہ کی کہاوتیں اور محاورے کسی بھی زبان کا بیش قیمت سرمایہ ہوتے ہیں۔ اور جب ان کا تخلیقی استعمال ادبی نمونوں میں ہوتا ہے تو بیان میں تہہ داری اور دبازت در آتی ہے۔ ان کا تخلیقی جمال اشعار میں علامتی حسن بھر دیتا ہے کہ کم لفظوں میں معنی کے جہان سمٹ آتے ہیں۔ مشکل زمینوں میں شعر کی روانی اور خیال کے فطری بہاؤ پر گرفت بنائے رکھنا ان کی علمی استعداد اور تخلیقی ہنرمندی کا قابلِ قدر نمونہ ہے:

جا کے تو اپنے ہوا خواہوں کا دل ٹھنڈا کر
خانہ بربادوں سے کیا چھیڑ نسیمِ سحری

●

دشمنوں کا تو چلا زور بھی اور جادو بھی
آرے چلتے ہیں جگر پر کہ مری کچھ نہ چلی
شیخ کترائے کہ جھنجھٹ نہ ہو ناحق سرِ رہ
سانس لی میں نے بھی کھل کر کہ بلا سر سے ٹلی

Scanned with CamScanner

وہ فرقت کی کلفت وہ قربت کی راحت
وہ 'اف اف' کی زینت وہ 'کھل کھل' کی رونق

●

خاک میں ملنا ہی ہے رہنے دو دم بھر اور یاں
حاملو! کچھ پر لگا کر اڑ نہیں جانے کی لاش

●

درج بالا آخری شعر اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔اس کے علاوہ دل ٹھنڈا کرنا، آرے چلنا، بلا سر سے ٹلنا، عقل کے دشمن جیسے محاوروں کا خوب صورت استعمال اور ساتھ ہی 'اف اف' اور 'کھل کھل' جیسے لفظوں سے تجربوں کی صورت گری لائقِ ستائش ہے۔باوجود مختصر شعری سرمائے کے زاہدہ خاتون شروانی کی شاعرانہ قامت عظمت کا مظہر ہے۔افسوس کہ اردو شعر و ادب کی اس دیدہ ور شخصیت نے محض اٹھائیس سال کی مختصر سی عمر میں ۱۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو اس جہان رنگ و بو کو الوداع کہہ دیا۔

●●

Scanned with CamScanner

رابعہ پنہاںؔ

سپہر آرا خاتون کا قلمی نام رابعہ پنہاںؔ تھا۔ ان کی ولادت ۷/ اگست ۱۹۰۶ء کو سہارن پور میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی عبدالاحد ڈی پی آئی آفس الٰہ باد میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ جن کا تعلق بریلی کے ایک علمی اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ پنہاںؔ نے فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی گھر پر ہی والد کے زیر سایہ حاصل کی۔ ان کی شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی غزلیں کہیں۔ شروع میں انہوں نے ماجدؔ الٰہ بادی سے اصلاح سخن لیا پھر علامہ سیمابؔ اکبر آبادی کے تلازمے میں شامل ہو گئیں۔ ۱۹۲۵ء میں والد کے انتقال کے بعد واپس اپنے آبائی مقام بریلی لوٹ گئیں۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں صوفی صغیر حسن پرنسپل اسلامیہ کالج الٰہ باد کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ کچھ عرصہ دہلی میں بھی اپنے شوہر کے ہم راہ گزارا۔ ان کی سگی بہنیں بلقیس جمال اور غزالہ بریلوی بھی اپنے وقت کی خوش فکر شاعرہ تھیں۔ تمام بہنوں کے کلام اپنے عہد کے مقتدر ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ رابعہ پنہاںؔ کا شمار ممتاز شاعرات میں ہوتا تھا۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں :

دیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ
شیشۂ چشم میں شراب کا رنگ

●

مژدہ باد اے جذبۂ خاموش شوق
اک تجلی آج زیرِ بام ہے

Scanned with CamScanner

پیچ و تابِ زلفِ پیچاں خم بہ خم
کون کہتا ہے جنوں ناکام ہے
شیشۂ مینا میں پنہاں برق ہے
حسنِ پرفن آج زیرِ دام ہے

●

جبینِ حسن پر سرخی سی دوڑی
نگاہِ آرزو نے کر دیا کیا
نیاز و ناز نا مقبول دونوں
نہ سمجھی میں کہ ہے تیری رضا کیا
نہ جانے کیا سمجھ کر ہنس پڑے ہیں
یہ ہے تمہید ذوقِ اعتنا کیا
نہ ہونا بھی بقدرِ یک نفس ہے
ہماری ابتدا کیا انتہا کیا

●

گزری تمام عمر خزاؤں کے درمیاں
اب التفاتِ فصلِ بہاراں کا کیا کروں

●

عشقِ جنوں نواز چلا بزمِ ناز میں
اک اضطراب وشوق کی دنیا لئے ہوئے
مرہم سے بے نیاز ہیں پنہاں یہ زخم دل
کیا کیا فسوں ہے چشمِ دل آرا لئے ہوئے

●

Scanned with CamScanner

کیا خبر تھی اس طرح لٹ جائے گا یہ کارواں
کیا پتا تھا در پئے آزار ہے یوں آسماں

●

تجلیوں نے نقاب الٹا لبوں پہ آیا حسیں تبسم
نوید آئینۂ تخیل تجھے وہ بے خود بنا رہے ہیں
عزیز خاطر ہے باغباں کی قفس کے خوگر بھی ہو گئے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں سے فصل گل میں نشیمن اپنا جلا رہے ہیں

●

رابعہ پنہاںؔ کا کلام جذبے کی شوخی، خیال کی برجستگی اور مترنم آہنگ کی روانی سے بھرپور ہے۔ تراکیب وتشبیہات اپنے عہد کے لسانی روایت کا حصہ تو ہیں مگر زبان بوجھل نہیں بلکہ نغمہ ریز ہے۔ پرکیف جذبہ وخیال کی پیش کش اثر انگیز لہجے میں کی گئی ہے اس لیے اشعار لطف دیتے ہیں۔ ایک شعر میں 'نہ سمجھی میں' ان کی نسائی فکر کی ترجمانی کر رہا ہے جو اپنے وقت کے لحاظ سے جدت کا اشاریہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ان کا تخلیقی سرمایہ دستیاب نہیں اس لیے ان کی زبان دانی اور جولانیِ فکر پر مکمل روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

انیسہ بیگم شروانی

انیسہ بیگم شروانی بیسویں صدی کی ابتدا کی شاعرہ ہیں۔ زاہدہ خاتون شروانیہ ان کی سگی ماموں زاد بہن تھیں۔ انیسہ بیگم کے شوہر ہارون خاں شروانی حیدر آباد کے مشہور اسلامی اسکالر تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ 'انیسیات' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ ۱۹۴۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری کی نمایاں خوبی شیرینی، لطافت اور زبان کی روانی ہے۔ ان کے یہاں جدید شاعرات کی آمد سے قبل ہی خود کی ذات کے لئے تانیثی فعل کا استعمال نظر آتا ہے۔ عصری قومی، ملی اور اصلاحی تحریکات کی لہریں بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہیں ساتھ ہی مذہبی رنگ کی جلوہ گری بھی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

کب اس جہاں سے چاہ کئے جا رہی ہوں میں
جب تک نبھے نباہ کئے جا رہی ہوں میں

●

کلیم اللہ پہنچے طور تک شوق تکلم میں
وہ دل میں جلوہ فرما ہے جو چاہے گفتگو کرلے

●

غلط کہ چشمۂ مذہب میں اب مٹھاس نہ ہو
عبث ہے اب یہ بقا بھی جو تم کو پیاس نہ ہو
تمہیں کہو یہ نگوں بخت کیا کرے آخر
ہوائے دہر جسے میری طرح راس نہ ہو

Scanned with CamScanner

مرے قصور حدودِ گماں سے بالا تر
ترا وہ 'فضل' کہ جس کا کبھی قیاس نہ ہو

●

منور ایک ہی جلوہ سے جنگل اور بستی ہے
نگاہِ شوق پر اب تک ترستی کی ترستی ہے
لبالب ہیں جہاں میں ہفت قلزم آبِ صافی سے
صدف پھر کس لیے اک بوند پانی کو ترستی ہے

●

جو ہیں علم و دولت میں فائق انہیں بھی
نہیں کسب و محنت سے کچھ عار دیکھو
بہم اتفاق اور تنظیمِ ملت
یہ ہیں کامیابی کے آثار دیکھو
میں کہتی ہوں جو غور سے اس کو سن لو
نہ سوچو! یہ ہے کس کی گفتار؟ دیکھو

●

ان اشعار سے انیسہ بیگم کی تخلیقی فکر اجاگر ہوتی ہے کہ ایسے وقت میں جب تہذیبی تقاضوں کے سبب شعر گوئی معیوب سمجھی جاتی تھی انہوں نے ایک باشعور اور دردمند عورت کی طرح اپنے خیال و فکر کو شعر میں نسائی عظمت اور تحمل کے ساتھ پیش کیا۔ اپنے تہذیبی وقار، تاریخی شعور اور فطری حساسیت سے بھری ایسی شخصیت اپنے تخلیقی عمل کے باعث تاریخ کے اوراق پر محفوظ ہو جاتی ہیں جن سے آئندگان کو روشنی ملتی رہتی ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

محمودہ خاتون محمودؔہ

آستانۂ چشتیہ دانا پور (پٹنہ) کے سجادہ نشین اور مشہور شاعر سید شاہ قائم چشتی نظامی قتیلؔ دانا پوری کی اہلیہ اور عہدِ حاضر کے معروف شاعر پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی والدہ محمودہ خاتون محمودؔہ پھلواروی صوفیانہ رنگ و آہنگ کی قادرالکلام شاعرہ تھیں۔ ان کی ولادت ۱۷؍رجب ۱۳۳۱ھ بہ مطابق ۲؍جون ۱۹۱۲ء میں پھلواری شریف (پٹنہ) میں ہوئی۔ انہوں نے حضرت شاہ محی الدین قادری، سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ محمودؔہ کی وفات محض ۴۲؍سال کی عمر میں ۴؍ربیع الاول ۱۳۷۴ھ بہ مطابق ۱؍نومبر ۱۹۵۴ء میں شاہ ٹولی، دانا پور میں ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کلام کا مجموعہ 'گلستانِ سخنِ محمودہ' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ نعتیہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال کے باوجود زبان کی سلاست اور روانی لائقِ تحسین ہے۔ رسول اللہ سے گہری محبت اور عقیدت کی عکاسی جذبات کی شدت میں چھلکتی نظر آتی ہے۔ لب ولہجہ پرسوز اور مسحور کن ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

بہت دشوار ہے ایوانِ الفت کا گرا دینا
بہت گہری دلوں میں عشق کی بنیاد ہوتی ہے

●

اف رے عالم تری رعنائی کا
آئینہ رخ ہے تماشائی کا

●

Scanned with CamScanner

گیسوئے شاہِ عرب صلے علیٰ
میرا مونس ہے شبِ تنہائی کا

●

کیا گزرتی ہے فلک پر دیکھئے
آج کچھ اچھا نہیں ہے دل کا رنگ

●

ہے نظر میں وہ چہرۂ روشن
آنکھ میں آفتاب رہتا ہے

●

ہر شکن میں ایک دل ہر موجِ غم میں اک جگر
پوچھئے اس زلف کے قیدی سے زنداں کی بہار

●

کسی کا درد ہو آنکھوں میں اشک ابل آئے
کسی کا غم ہو دلِ زار درد مند ہوا

●

ہوش ہیں جلووں سے اڑتے ہر طرف مثلِ پری
کوچے کوچے پر مدینہ کے ہے عالم قاف کا

●

قطرہ قطرہ نوح کا طوفان ہے
دیدۂ تر میں مرے دریا ہے ہیچ

●

Scanned with CamScanner

مذکورہ اشعار محمودہ کی درد مند شخصیت اور جمالیاتی شعور کے ترجمان ہیں۔مدینہ کی گلیاں قاف جیسی اور ہوش کا پریوں کی مانند اڑنا، آنکھ میں آفتاب رہنا، دیدۂ تر کے آگے دریا کا ہیچ ہونا، یہ سب ان کے تخیل کی دل نشین تصویریں ہیں جن میں ان کی فطری شخصیت کی نزاکت لطافت اور نفاست کی آمیزش ہے۔ان کے دل کی گہرائیوں میں عشق کی بنیاد پڑی ہے۔

تخلیق کائنات کا سبب یہی عشق ہے۔اس کی وسعتیں بے کراں ہیں۔یہ مکاں سے لامکاں تک پھیلا ہوا ہے۔اس کی انتہا خدا اور محبوبِ خدا سے والہانہ محبت ہے جو عشقِ حقیقی کہلاتا ہے۔اردو شاعری میں اس باب کو صوفیانہ رنگِ تغزل کا نام دیا جاتا ہے۔اس رنگ میں شعر کہنا تخلیق کے لمحوں میں تخلیق کار کے لئے پل صراط پر چلنے کا ہوتا ہے کیوں کہ حدِ ادب اس کی پہلی اور لازمی شرط ہے۔باوجود والہانہ عشق کے جوشِ خیال کا ضبط اور نوکِ قلم کا تحمل تخلیق کار کو سرخ رو کراتا ہے۔اس اعتبار سے محمودہ خاتون محمودہ اپنی تخلیقی آگہی اور روشن شعور کے باعث غزل کے سرمایہ کو وقیع بنانے میں کامیاب ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

زیبؔ عثمانیہ

تاجور زیبؔ عثمانیہ مشہور شاعر غلام محمد خاں یکتا کی بھتیجی تھیں۔ان کی ولادت ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۳ءکولدھیانا میں ہوئی تھی۔ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت یکتا کی ہی آغوش میں ہوئی۔زیبؔ کا خاندانی اور تہذیبی پس منظر خالص اسلامی تھا اس لیے اس زمانے کے رواج کے مطابق تعلیم گھر میں رہ کر ہی حاصل کی۔ اپنی ذہانت اور فراست کے سبب جلد ہی اردو اور فارسی زبان وادب پر مضبوط گرفت بنالیا۔قدرت کی جانب سے شاعرانہ دل ودماغ لے کر جنم والی اس شاعرہ کے شاعر چچا یکتا نے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔

ذوق وشوق کے مطابق خوشگوار ماحول کے زیر اثر زیبؔ کی صلاحیتوں کو جلا ملی۔فقط چند سال کے مشق سخن نے ان کے کلام میں بلندی اور پختگی پیدا کردی۔اور پہلی بار دسمبر ۱۹۲۷ءکے لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مشاعرہ میں ایک نظم 'مقصدِ حیات' کے ساتھ بلند پایہ اور پختہ گو شاعرہ کی حیثیت سے متعارف ہوئیں۔اور اس نظم پر انجمنِ اردو پنجاب کی جانب سے طلائی تمغہ بھی پایا۔ان کی شادی فروری ۱۹۳۳ءمیں پھوپھی زاد بھائی سلطان بہاالدین کے ساتھ ہوئی۔

زیب عثمانیہ نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی۔یہ وہ دور تھا جب شعروادب پر اقبالؔ کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔اس لیے شاعرہ کی حساسیت نے نہ صرف اپنے ماحول کا اثر قبول کیا بلکہ اقبالؔ کے پیام وکلام کو بھی اپنے اندر اتارنے کی بھی کوششیں کیں۔اس شعوری تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری میں بھی پیام بیداری، تلقین عمل اور درس خودی کے مضامین در آئے۔مثلاً :

ہیں خندہ زن تری حالت پہ شمع وآئینہ
کسی کے بزم میں اپنا مقام پیدا کر

Scanned with CamScanner

کسی کی بزم میں مڑ مڑ کے نقشِ پا نہ دیکھ
مہ و ستارہ کی شانِ خرام پیدا کر

•

کیا چیز تھی بھلا وہ ہر دورِ معصیت میں
جس نے جہاں میں قوموں کی آبرو بچالی

•

نادان ہیں کچھ وادیٔ ایمن سے ہی مخصوص
دنیا میں ہر اک ارضِ محبت ہے شرر بیز
اس قوم کا آفاق پہ چھا جانا ہے ممکن
سیلاب صفت جس کا ہو ہر پیکرِ نوخیز

•

آزادیٔ افکار سے جو بھی ہوئی محروم
سچ یہ ہے کہ اس قوم کو جینے کا بھرم کیا

•

زیبؔ کی بلند نگاہی زندگی کی گہری حقیقتوں کا جائیزہ لیتی ہیں۔ اپنے عہد کے پے چیدہ ملکی، ملی اور سیاسی مسائل شاعرہ کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اپنی قوم کی ناداری اور پامالی پر وہ گہرے ملال سے بھر جاتی ہیں۔ انہیں مغربی قوم کی سفاکی اور ہندوستانی عوام کے انسانیت سوز استحصال کا خوب علم ہے۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے انگریزوں سے نرم وخوش گوار رشتوں کی بھی خبر ہے۔ اس طبقاتی اختلاف پر ان کا حساس اور دردمند دل کڑھتا ہے، جس کی جھلک ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ اپنے فکر و خیال وہ اس طرح شعر میں پیش کرتی ہیں۔

کسی کے چار تنکے ہوں چمن میں
فلک کی آنکھ میں وہ آشیاں ہے

•

Scanned with CamScanner

وہ جس کو زیبؔ کہتا ہے زمانہ
بری حالت ہے اس درد آشنا کی

●

فلک کی طرفہ کاری ہے کہ آج اے زیبؔ دنیا میں
جو تھے صیاد وہ خود طائرِ بے بال و پر نکلے

●

اٹھا ہے محفلِ ہستی سے اعتماد و وفا
کہو کسی سے کہ رسمِ جفا پہ ناز کرے
خدا بھی ہو تو کبھی کوششِ نیاز نہ کر
اگر وہ تجھ سے کوئی احتیاطِ راز کرے

●

ترے صحرا و بیاباں تو ہیں آباد تمام
مرا حسرت کدۂ قلب ہی آباد نہیں

●

ضیغمانِ حق سے کوئی جا کے پوچھے آج زیبؔ
پیشِ باطل کتنا بے موقع ہے ان کا انکسار

●

بتاتے ہیں جسے قشقہ و محراب
بہت معروف ہیں شکلیں ریا کی

●

درج بالا اشعار میں ضیغمانِ حق کو مخاطب کرتی اور ریا کی شکلیں دکھانے والی

Scanned with CamScanner

شاعرہ کا لہجہ طنز کی کاٹ لیے ہوئے ہے۔ حالاں کہ مجموعی اعتبار سے ان پر موضوع اور اسلوب دونوں سطح پر رنگِ اقبال حاوی ہے مگر سچائی اور دردمندی سے پیش کیے گئے اشعار قابل غور ہیں۔ کہ ایک نسائی اور پر وقار آواز قوم و ملک کا درد سمیٹے پوری سچائی اور ایمان داری سے علامہ کی ہم آواز ہونے کی کوشش میں مصروف تھی:

غنچے کی جیبِ رنگیں نقدِ خودی سے خالی
ضعفِ خودی کی شاہد سبزے کی پائمالی
اے زیب مشرقی ہوں قومیں کہ مغربی ہوں
ہے جن کا عزم عالی ان کے نصیب عالی

●

اے کہ مرا مقامِ عجز تیری نظر میں ہیچ تر
کس کو خبر کہ یہ بھی اک منزل کبر و ناز ہو

●

تو صاحبِ تدبیر نہ میں صاحبِ تدبیر
تدبیر پہ موقوف ہے ہر قوم کی تقدیر
مغرب کی نظر کیفِ امارت سے پر از خواب
مشرق کی نگاہوں میں عیاں قوتِ تعبیر

●

قطرے قطرے کو بھریں تیرے سبوکش لاچار
ہے یہ کس کے لیے عبرت کا مقام اے ساقی

●

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری
کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہاری نہ غفاری

Scanned with CamScanner

بہر کیف ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیبؔ عثمانیہ نے اس میں اپنے خون جگر کے قطروں کو شامل کیا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ۱۹۴۱ء میں 'متاع حرم' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ گھریلو نسائی شخصیت ہونے کے باوجود ان کی شاعری اپنے عصر کی ترجمان ہے۔ اپنے معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے شاعری کی پرخطر مسافتوں کو اعتماد اور یقین کے ساتھ کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اظہارِ فکر کی یہ جرأت قابلِ تحسین ہے۔

●●

rekhta

Scanned with CamScanner

بشیر النسأ بیگم بشیر

بشیر النسأ بیگم کی ولادت ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کے والد عبدالرحمٰن خاں بہ سلسلۂ ملازمت جیوڈیشیل آفس حیدر آباد سے منسلک تھے۔ جن کا تعلق شہر کے تعلیم یافتہ اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ بشیؔر کے شوہر مرزا ضامن علی خازی حیدر آباد کے نامی گرامی کانٹریکٹر میں شمار ہوتے تھے۔ حیدر آباد کے علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کی روح رواں بشیر النسأ بیسویں صدی کی ابتدا کی مشہور شاعرہ تھیں اور بشیر تخلص کرتی تھیں۔ کبھی کبھی ابوظفر عبدالواحد سے مشورۂ سخن بھی کرتی تھیں۔ ان کی وفات فروری ۱۹۷۲ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔

بیسویں صدی کے ابتدائی منظرنامہ پر اقباؔل کی شاعری نے گہرے نقوش مرتب کیے۔ کیا شعرا اور کیا شاعرات سب اسی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ بشیر النسأ بشیؔر کی شاعری پر بھی رنگِ اقباؔل کی گہری چھاپ ہے۔ ان کی غزلوں میں انسانی ہم دردی، قومی جذبات، نسائی وقار و عظمت کے ساتھ فکر و خیال کی بلندی اور پاکیزگی بھی نمایاں ہے۔ لہجہ پر لطف اور پرسوز ہے۔ چند اشعار بہ طور مثال دیکھیے:

جو لذت میسر ہے ذوقِ طلب میں
نہیں اس سے واقف ترے عرش والے

●

گردش چرخ کہہ رہی ہے بشیؔر
جذبِ کامل سے کیا نہیں ہوتا

●

Scanned with CamScanner

فرشتے بھی نہ تھے واقف کہ یوں بن جائے گی دنیا
نہاں رازِ حیاتِ دہر تھا گندم کے دانوں میں

●

چمن میں پھول ہوں، گل میں بہ رنگِ بو ہوں پوشیدہ
کہیں تعبیر ہستی ہوں، کہیں خوابِ پریشاں ہوں

●

نہ کوئی رازداں اپنا نہ کوئی ہم زباں اپنا
دلِ پر داغ کے دم تک ہے عالم میں نشاں اپنا
نہیں ہے جذبۂ اظہار پابندِ زباں بندی
سرشکِ دیدۂ خوں بار ہوگا ترجماں اپنا

●

بشیرؔ اب گردشِ شام وسحر کی یاد باقی ہے
کہاں تک ساتھ دے سکتے زمین وآسماں اپنا

●

بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں مہذب گھرانوں کی عورتوں کا شعرگوئی کی جانب جھکاؤ قابلِ تحسین کارنامہ ہے کہ انہوں نے صدیوں کی معاشرتی اور تہذیبی جکڑ بندی اور فرسودہ رواجوں کے خلاف قلم سنبھالا۔ ضروری نہیں کہ نسائی قلم سے نکلے الفاظ احتجاجی نعروں اور باغی تیوروں پر مشتمل ہوں۔ اہم یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جذبہ وخیال کو زبان دینے کی کوشش کی۔

●●

Scanned with CamScanner

صالحہ بیگم مخفی

تقسیم ہند سے قبل صالحہ بیگم مخفی شمالی بہار کی معتبر شاعرہ تھیں۔ان کی ولادت ۱۹۱۵ء میں مظفر پور ہوئی۔ان کے والد ابوالحسن نیساں بہار کے مشہور شاعر تھے۔ان کا تعلق مظفر پور کے ایک زمین دار گھرانے سے تھا۔مخفی کی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ان کے چچا ریاض حسن خاں خیال کے زیر سایہ ہوئی جو خود بھی اردو اور فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ان کا گھرانہ علمی ،ادبی اور تہذیبی اعتبار سے مظفر پور ہی نہیں بلکہ صوبہ بہار میں معتبر مقام رکھتا ہے۔ان کے شوہر سید ذکی حسن بھی شعروادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔مخفی فطری شاعرہ تھیں ان کی شعر گوئی کی ابتدا گیارہ سال کی عمر میں ہوئی۔ان کی زبان خاندانی تہذیب کا نمونہ ہے۔اردو اور فارسی غزل کی تابناک روایت کو انہوں نے تاریخی اور تہذیبی روایت جان کر استفادہ کیا۔ان کی غزلیں تغزل کی خوب صورت مثال ہیں۔

مخفی کی غزلیں محض روایت کی تقلید نہیں بلکہ اس میں ان کے منفرد جمالیاتی شعور کی کرنیں جگمگا رہی ہیں۔انہوں نے بھاری بھرکم فارسی تراکیب و تلازمات کے بجائے روزمرہ کے رواں الفاظ کا استعمال کیا ہے جس کے سبب طرزِ بیان میں ایک بے ساختگی جھلکتی ہے۔ہم عصر شاعرات کے برعکس ان کے یہاں تانیثی صیغہ کا استعمال ان کی نسائی شخصیت کا زائیدہ ہے۔جذبے کی فراوانی اور احساس کی شدت اشعار کو پر کیف بناتی ہے۔ان کی غزلیں عشق سے عبارت ہیں۔عشق جو کائنات کی بنیاد بھی ہے اور فطرت کے سارے مظاہر میں جاری و ساری بھی۔انسان کا دل بھی اس جذبے سے اچھوتا نہیں۔یہ جذبہ جتنا وسیع ہے اتنی ہی نیرنگیاں بھی رکھتا ہے۔اس لیے غزل کو بھی یہ موضوع

Scanned with CamScanner

اپنی رنگارنگی سے بہار آشنار کھتا ہے۔ تحفی کے اشعار اس کے شاہد ہیں:

گلشن ترے بغیر نہ صحرا ترے بغیر
اس عشق نے کہیں کا نہ رکھا ترے بغیر

●

تجھ کو چاہا تو یہ ایسی کوئی تقصیر نہیں
عشق گو جرم سہی، لائقِ تعزیر نہیں

●

آپ کی بے التفاتی سے شکایت تھی مجھے
جب محبت سے ملے سارا گلہ جاتا رہا

●

بظاہر مل رہے ہیں کس محبت سے، عقیدت سے
مگر دل کی کدورت، مہرباں کچھ اور کہتی ہے

●

تجھے کیا بتاؤں تحفی کہ مری غزل ہے کیسی
کبھی درد کا فسانہ، کبھی عشق کا ترانہ

●

وائے عشق میں رہا نہ حواس
لٹ گیا ہائے قافلہ دل کا

●

ادھر کر لے، ادھر کر لے، عیاں کر لے، نہاں کر لے
نمازِ عشق کا سجدہ جہاں چاہے وہاں کر لے

●

کوئے جاناں کا مل گیا رستہ
ہو گیا راہ بر ہمارا عشق

Scanned with CamScanner

شاد و آباد غم کی دنیا ہے
بے سہاروں کا ہے سہارا عشق

●

تحفی کے یہاں تغزل کے دونوں زاویے ہیں، عشق مجازی بھی اور حقیقی بھی۔ خیال وفکر کے بیان میں اصل کمال اندازِ بیان کا بھی ہوتا ہے۔ان کے بیان کی شگفتگی بھی لائقِ توجہ ہے۔ عام فہم لفظوں اور محاوروں میں رنگ بھرنے کے ہنر کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔:

الزام محبت کا ناحق مجھے دیتے ہیں
پوچھو تو پڑی کس کی دزدیدہ نظر پہلے

●

حسن والے نہ گر جگہ دیتے
دربدر پھرتا مارا مارا عشق

●

میں نے پوچھا کہ کبھی ربط بھی تھا ہم سے تجھے
کس رکھائی سے کہا اس نے 'مجھے یاد نہیں'

●

طوفان سے لے ٹکر، گر خواہشِ منزل ہے
وہ سامنے ساحل ہے، موجوں سے گزر پہلے

●

اس دل وحشی کے ہاتھوں دربدر پھرتے رہے
ہم سراپا عشق بن کر ٹھوکریں کھاتے رہے

●

واللہ وہی بات آن پڑی جس بات سے کل ہم ڈرتے تھے
اس عشق کے پھندوں میں پھنس کر ہم ان سے محبت کر بیٹھے

Scanned with CamScanner

مخفی کے یہاں عشق کا دوسرا پہلو بھی جلوہ گر ہے جسے صوفیانہ رنگ کہا جاتا ہے ۔عقیدتِ رسول کے جذبے محبت کا الگ ہی رنگ دکھاتے ہیں۔ مثلاً:

مجھے بھی بادۂ توحید ، ساقیٔ کوثر
پلادے آنکھوں میں آنکھوں سے جام کے بدلے

●

شفا جس سے بیمار الفت کی ہوتی
کہیں ایسا یارب مسیحا نہ دیکھا

●

اس تمنا کے سبب انہیں مدینہ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور فریضۂ حج سے بھی سرفراز ہوئیں۔ بہرکیف صالحہ بیگم مخفی اپنے جمالیاتی شعور، جذباتی وفور اور شگفتہ بیانی کے باعث بیسویں صدی کے نصف اول کی معتبر اور قابلِ احترام شاعرہ ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

حیاؔ لکھنوی

تقسیم ہند سے قبل کی شاعرات میں ایک اہم نام کنیز فاطمہ حیاؔ کا بھی ہے۔ یہ لکھنؤ کے مشہور قانون داں چودھری نعمت اللہ کی صاحب زادی تھیں اور اپنی ادارت میں ایک ادبی رسالہ ’حیا‘ کے نام سے لکھنؤ سے نکالتی تھیں۔ اس وقت ان کی ترقی پسندی کا یہ عالم تھا کہ زنانہ پارک لکھنؤ کے ہفتہ وار جلسوں میں شریک ہوکر خواتین کی تہذیبی اور اصلاحی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔ اس کے علاوہ خواتین کی مختلف انجمن کی مخلص اور فعال رکن تھیں۔ لکھنؤ علمی، مذہبی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے ہندوستانی تاریخ اور اردو شعروادب کا سنہرا باب رہا ہے۔ یہاں کی ہواؤں میں شعریت رچی اور ادبیت بسی ہوئی ہے۔ اسی ادبی گہوارے میں جنمی اور پلی بڑھی کنیز فاطمہ نے حیاؔ تخلص رکھ کر گیارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ان کی پہلی نظم ’ گلاب‘ تہذیبِ نسواں لاہور میں شائع ہوئی تھی۔

حیاؔ لکھنوی کی شاعری کا مزاج رومانی ہے۔ ان پر اخترؔ شیرانی کے شاعرانہ رنگ کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ وہی جذبات کی شدت اور لہجے کی موسیقیت جو اخترؔ کا وصف ہیں، حیاؔ کے اشعار میں بھی رچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رومان پسند ہونے کے باوجود فطری تحمل اور متانت سے شعری فضا کی تخلیق ہوئی ہے۔ ذاتی تجربات کے ساتھ ماحول کے تفکرات بھی ان کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ رنگِ سخن روایتی ہونے کے باوجود شاعرہ کی قادرالکلامی اور اظہار کی پختگی ان کی غزلوں کی جان ہے:

تمنا ہے فزوں ہوں شورشیں جذبِ محبت کی
دلِ مضطر کی بڑھتی اور بھی وحشت تو اچھا تھا

Scanned with CamScanner

نگاہِ شوق اگر دل کی ترجماں ہو جائے
تو ذرہ ذرہ محبت کا رازداں ہو جائے
زباں سے کیجئے رسوائے نالہ کیوں اس کو
وہ راز آنکھوں ہی آنکھوں میں جو بیاں ہو جائے
بجا ہے محفلِ ہستی میں پاسِ رسوائی
گدازِ شمع مرے دل کی داستاں ہو جائے

●

شوق کہتا ہے کہ چلئے کوئے جاناں کی طرف
چاہئے وارفتگی کی پاس داری ان دنوں

●

جذباتی اعتبار سے حیا کا کلام بہت پر کیف ہے۔ مگر ایک سوگواری کی فضا ہے جو پوری شاعری میں موجود ہے جس کے سبب لہجہ پرسوز اور پر ملال ہے۔ باوجود رومان پرور جذبات اور وجد آگیں احساسات کے بیان شبنمی ہے:

کیا تقاضہ کیجیے ان سے نگاہِ لطف کا
بے نیازی ہے وہاں، یاں سوگواری ان دنوں
آہ یہ برسات کا موسم یہ زخموں کی بہار
ہو گیا ہے خونِ دل آنکھوں سے جاری ان دنوں
پھر بہار آئی ہے جی اٹھا ہے یادِ دوست میں
دل کرے زاری اور آنکھیں اشک باری ان دنوں

●

ہے دل کشی میں وہی اب بھی موسموں کی بہار
نظر میں کیفیتِ رنگ و بو نہیں باقی
ہیں ساتھ آج بھی سو شورشیں مگر دل میں
سکت نہیں ہے جسارت کی خو نہیں باقی

Scanned with CamScanner

حیاؔ ٹھکانہ بھی ہے کچھ ایسی درد مندی کا
کہ لب تک آئے نہ اک حرف اور بیاں ہو جائے

●

یہ افسردگی اور اضمحلال کی کیفیت ان کی غزلوں میں جا بجا جھلکتی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے حیاؔ کی شاعری زندگی کے رنگین جذبوں کی ترجمان ہیں۔ محبت کی شدت اور خیال کی رنگینی ان کے اہم اُوصاف ہیں۔ شعور کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ نزاکتِ ادا مجروح نہیں ہوتی بلکہ ہر جذبہ وخیال نفاست اور روانی کے ساتھ شعر میں ڈھل جاتا ہے۔ شوق کی بے تابی، حسن کی بے نیازی اور ہجر کی الم ناکی ان کے اہم موضوعات ہیں۔ ان قلبی وارداتوں کی پیش کش میں طرزِ کلام کی بے ساختگی اور بے تکلفی میں جذبے کی پاکیزگی کی ہم آہنگی نمایاں ہے۔
ایسا نہیں ہے کہ حیاؔ نے صرف دل میں پھوٹتے اور کونپل بنتے عشقیہ جذبوں کی ہی پرورش کی ہے بلکہ ان کے یہاں کم ہی سہی لیکن ان کی دردمندی کے سبب اپنے عہد کے مسائل پر بھی فکر کے جگنو جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:

چھوڑ دو اس بے وفا دنیا کو تم بھی اے حیاؔ
کر نہیں سکتا ہے کوئی غم گساری ان دنوں

●

چمن وہی ہے، گھٹائیں وہی، بہار وہی
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی
ہے کائنات کے ہر ذرہ میں گہر ریزی
نگاہِ فکر کو خود جست و جو نہیں باقی
گلے تو ملتے ہیں احباب اے حیاؔ اب بھی
مگر دلوں میں، صداقت کی بو نہیں باقی

●

بہر کیف حیاؔ لکھنوی کی غزلیں اپنے عہد کے اعتبار سے اردو شاعرات کی تاریخ کا

Scanned with CamScanner

ایک اہم باب ہیں۔جن کے ذریعہ شاعرہ کے تخیل کی شادابی اور احساس کی سچائی ایک نغمہ ریز اسلوب میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔اردو کی طویل شعری روایت چوں کہ محبوب کے زلف و رخسار کی مدح سرائی رہی ہے اور اس کی تقلید کرتے ہوئے ابتدائی شاعرات نے بھی وہی روش اپنائی مگر ان مضامین کو کچھ جدت اور ندرت سے پیش کرنے کوشش بھی بعض شاعرات نے کی ۔ان میں ایک نام حیاؔ لکھنوی کا بھی ہے۔پھر بھی ان کے یہاں نسائی جذلوں کی کوئی کرن چمکتی نظر نہیں آتی کیوں کہ اس زمانے میں عورتوں کو اتنی ذہنی آزادی نصیب نہیں تھی کہ وہ خود کی شخصیت کو شاعری کا موضوع بنائیں۔اس لیے اپنی ترقی پسندی، سماجی اور اصلاحی کارناموں کے باوجود ان کا لب ولہجہ روایت سے ہی مربوط نظر آتا ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

صفیہ شمیم

صفیہ شمیم کی ولادت ۲۷؍ مارچ ۱۹۲۰ء میں ملیح آباد میں ہوئی۔ ان کے دادا فقیر محمد گویا ریاستِ اودھ کی فوج میں رسالہ دار تھے۔ جوش ملیح آبادی ان کے سگے ماموں تھے، جنہیں دنیا شاعر انقلاب کہتی ہے اور جن کا شمار ان نام ور شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے ایک عہد کو اپنے رنگِ سخن سے متاثر کیا۔ اس اعتبار سے صفیہ شمیم کو ذوقِ شاعری وراثت میں ملا اور اسی وجہ سے ان کی شاعری پر جوش کے رنگ کی گہری چھاپ بھی ملتی ہے۔

اردو غزل کی بنیاد رومانیت پر رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بیسویں صدی کی انقلابی تبدیلیوں کے سبب جہاں سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی مختلف مرحلوں سے گزری وہیں شعروادب کے پیمانے بھی ردوقبول کی آزمائشوں سے دوچار ہوئے۔ اور دل کے ساتھ زمانے کے تجربات و مشاہدات بھی ان کا موضوع بننے لگے۔ لیکن ان تاریخی تبدیلیوں کے باوجود ہر شاعر فطری طور پر رومانی ہی رہا بھلے ہی زینہ بہ زینہ عمر کے ساتھ ساتھ تفکر کی لہریں بھی ان کے یہاں اپنی موجودگی درج کرانے لگیں۔ صفیہ شمیم بھی بنیادی اعتبار سے رومانی رنگِ سخن کی شاعرہ ہیں۔ جس کی مثال ان کا فطری تغزل ہے۔ جس کے سبب ان کی غزلوں میں محبت کا ابدی نغمہ بڑی رنگینی اور دل فریبی سے پیش ہوا ہے۔ تصورِ عشق کو انہوں نے جدت اور ندرت سے آمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ تراشیدہ اور مترنم لفظوں سے سجا اور بانکپن سے بھرا ان کا لطیف طرزِ اظہار خیال کی متحرک تصویریں پیش کردیتا ہے۔ چند مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

مجھے گماں نہ ہوا ان کی بے نیازی کا
کچھ اس ادا سے وہ بے گانہ وار گزرے ہیں

Scanned with CamScanner

ٹھہر اے بادِ خزاں ایک نفس کی مہلت
رنگِ گلشن کو ابھی اور نکھر جانے دے

●

کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

●

ہونا ہے دردِ عشق سے گر لذت آشنا
دل کو خرابِ تلخیٔ ہجراں تو کیجئے

●

یہ وضع دارئ اہلِ وفا کوئی دیکھے
گلے تو رکھتے ہیں لیکن زباں نہیں رکھتے

●

رومانی شاعری میں جذبے کی شدت تخیّل کی بلند پروازی اور لہجے کی گہرائی کی بہت اہمیت ہے۔ صفیہ شمیم کے یہاں جذبۂ عشق کی والہانہ کیفیت اور سرشاری ہے جس کی نشاط انگیز لہریں غزل کی فضا میں لطیف جمالیاتی رویہ کی نزاکت سے ایک فسوں طاری کر دیتی ہیں۔ لطیف اور نازک تشبیہات کے ذریعے مظاہر فطرت کو دل فریب بنانے کے ہنر سے وہ خوب آگاہ ہیں۔ بہار، خزاں، کلی، گل، ہوا، چمن، گلستاں، چراغ اور شمع وغیرہ جیسے الفاظ جو روایتی رنگِ شاعری کی اہم شناخت ہیں شمیم کے یہاں فقط پیروئ روایت کے طور پر نہیں بلکہ ان کے تخلیقی شعور اور جمالیاتی حسیت میں گھل مل کر فن کارانہ اظہار پاتے ہیں۔ وہ لفظی تصویروں میں انسانی جذبات کا رنگ بھر کر اسے نفاست اور نزاکت سے سنوارتی ہیں۔ ان تصویروں کے چند نمونے حاضر ہیں:

چہرہ عرق عرق ہے ادائیں تھکی تھکی
نظارۂ جمال پشیماں نہ پوچھئے

●

Scanned with CamScanner

یہ جمال لالہ وگل یہ فروغ صبح خنداں
وہ چمن میں مسکرائے کہ بہار مسکرائی

●

کر دیا بادِ خزاں نے خاک سارا گلستاں
لب ہلے ہی تھے کلی کے مسکرانے کے لئے

●

اک بجھا سا چراغ حسرت ہیں
اک لٹی سی بہار ہیں ہم لوگ

●

شمع ِ امید جلا بیٹھے تھے
دل میں خود آگ لگا بیٹھے تھے

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ شمیم کو فنی باریکیوں کے علم کے ساتھ ساتھ شعری روایت کا بھی گہرا شعور تھا۔ اسی سبب نو خیز اور رنگین جذبات بھی فطری تحمل اور لطیف شائستگی کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔ مثلاً ایسے اشعار:

آئیں مرے خیال میں وہ بار بار کیوں
خوابوں میں آ کے روز کریں بے قرار کیوں

●

کسی کے حسن جہاں تاب کا نکھار ہیں ہم
چمن کا حسن ہیں رنگینیٔ بہار ہیں ہم
بہ ایں کشاکش حرماں بہ ایں غم دوراں
کسی کے چشم کرم کے امید وار ہیں ہم

●

وہ کرم تھا یا ستم تھا کہ نہ پھر قرار آیا
مجھے ان کی خیر خواہی نہ شمیم راس آئی

Scanned with CamScanner

وفا ہو نہ ہو وعدہ تو کرے آنے کا
مجھے رہینِ غمِ انتظار تو کر دے

●

لیکن وقت کے بہاؤ کے ساتھ ان جذبوں میں سنجیدگی آتی جاتی ہے۔ پھر ایسا موڑ بھی آتا ہے جب شاعرہ کا دل غم کی آنچ میں سلگنے لگتا ہے۔ محبوب سے جدائی اور تنہائی کا گراں بار کرب ان کا مقدر بنتا ہے۔ ایسے میں زندگی کے حالات کا سامنے کرتے پلکیں نم بھی ہو جاتی ہیں۔ غم تو زندگی کی آزمائش ہے اور شمیم اس سے ہارتی نہیں بلکہ نبرد آزما ہوتی ہیں ان کے اندر کی فطری توانائی، حوصلہ ، امید اور آس انہیں آگے کی طرف رواں دواں رکھتے ہیں۔ گو کہ وہ شکوہ کناں بھی ہوتی ہیں اور لب ولہجہ زخم کی ٹیس اور کسک سے بھر جاتا ہے مگر تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ چند اشعار سے یہ کیفیت سامنے آجائے گی:

آلام وغم کے تند حوادث کے سامنے
اتنا لطیف دل مرے پرور دگار کیوں

●

دے موت ہی شاید غمِ ہستی سے رہائی
ہستی تو ہے اک صورتِ زنداں مرے

●

زندگی کی بدل گئی صورت
جب غموں سے ہوئی شناسائی

●

کیا قیامت تھی پردہ داریٔ غم
مسکراتے ہی آ گئے آنسو

●

Scanned with CamScanner

وہ حسرتِ بہار نہ طوفانِ زندگی
آتا ہے پھر رلانے کو ابرِ بہار کیوں

●

نہ لطفِ برق سے واقف نہ زورِ طوفاں سے
جو بد نصیب کوئی آشیاں نہیں رکھتے

●

بہاریں آئیں بھی اور ہو گئیں رخصت مگر اب تک
گلستاں میں گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی

●

ان اشعار میں شاعرہ نے ذاتی تجربوں کے پہلو بہ پہلو ماحول کے مشاہدوں کو بھی زبان دینے کی کوشش کی ہے۔ جن میں عصری زبوں حالی کے ہلکے ہلکے نقوش ابھرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی نام ہے طوفان سے مقابلہ کرنے کا۔ کیوں کہ جن کے پاس آشیاں ہی نہیں ہوتے وہ بجلیوں کے قہر اور طوفان کے تھپیڑوں سے انجان رہتے ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی صفیہ شمیم کا اسلوب نکھرا ستھرا ہے۔ لفظیات بھی سبک اور مترنم ہیں۔ تشبیہات و تلازمات کو نفاست سے برتنے کا ہنر بھی جھلکتا ہے جس سے ان کے تخلیقی شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔ فکر و خیال سچائی اور خلوص کا مظہر ہیں۔ ان سب خوبیوں کے باوجود نسائی شخصیت کی کوئی لہر جذبے یا بیان کی سطح پر نظر نہیں آتی۔ گو کہ لہجہ مردانہ بھی نہیں لیکن نسائیت سے عاری ہے کہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ ایک شاعرہ کا کلام ہے۔ لیکن ان کے وقت کے اعتبار سے یہی غنیمت ہے کہ انہوں نے جذبوں کے اظہار کے لیے صنفِ غزل کا انتخاب کیا جب تہذیبی تقاضوں کے سبب شاعری عورتوں کے لیے شجرِ ممنوعہ تھی۔

●●

Scanned with CamScanner

رابعہ سلطانہ ناشاؔد

رابعہ سلطانہ ناشاؔد کی ولادت ۱۹۲۱ء میں آرا (بہار) میں ہوئی۔ ان کے والد ابوالخیر محمد اشرف کا تعلق آرا کے زمین دار گھرانے سے تھا۔ ان کے شوہر صفدر امام شعر و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ 'معمار' تھا۔ ناشاد کی تعلیم گو کہ گھریلو تھی لیکن زبان وادب کے مطالعے کے سبب زبان و بیان پر گرفت قابل دید تھی۔ ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ انہیں پروفیسر عباس علی خاں بےخوؔد اور شوؔق رام پوری دونوں ہی سے تلمذ کا شرف حاصل رہا ہے۔ جب شاعرہ کی عمر گیارہ سال کی تھی تب ہی ان کے شفیق والد کا انتقال ہو گیا۔ پھر پے در پے ماموں، چچا اور جواں سال بھائی کی موت غم جھیلنا پڑا۔ ۱۹۴۲ء میں چھ سال کی ننھی سی عمر میں عزیز از جان بیٹے نواز امام کی موت گہرے صدمے سے دوچار کر گئی۔ یکے بعد دیگرے اپنے عزیزوں کی مفارقت کا غم ناشاؔد کو مستقل درد دے گیا۔ اس لئے ان کی شاعری کی فضا کرب آمیز ہے۔ جس میں غموں کی تپش اور دکھ کی آنچ موجود ہے۔ لیکن شاعرہ نے اسی درد کو زندگی کا سرمایہ سمجھ کر اس کے ساتھ جینے کے الگ ہی انداز اپنائے ہیں۔ غم کی بے کرانی اور اس کی جان لیوا اذیت کے سبب لب ولہجہ میں سوگواری کے ساتھ سوز کی کیفیت شامل ہے۔ ان کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام 'سوزِ دل' 'جذباتِ ناشاؔد' 'ناسور' اور 'طوفانِ غم' ہیں۔ ان کے پر ملال اور دل گرفتہ جذبوں کے آئینہ دار چند اشعار مثال کے طور پر درج ہیں:

تری دنیا میں رہ کر کیا کریں گے
خدایا عمر بھر رویا کریں گے

Scanned with CamScanner

فراقِ یار نے کچھ ایسا حالِ زار کیا
ملول دل نے کیا غم نے بے قرار کیا

●

درد ہی ہے وہ چیز کہ جس کو
بھولنا چاہوں بھول نہ پاؤں
بس کہ ترے بن چین نہیں ہے
چاہت کی حد کیسے پاؤں
کون ہے اے ناشاد مسیحا
کس کو دل کے زخم دکھاؤں

●

میں نے گھر تک جلا کے دیکھ لیا
ان کے گھر تک ہی روشنی نہ گئی

●

مرے نصیب میں لکھی تھی کیوں شبِ فرقت
رقیب نے مرے ، اللہ شرم سار کیا

●

ادھر منتظر ہیں لگی در پہ آنکھیں
ادھر ان کو آنے کی فرصت نہیں ہے
بہت التجا سے گیا نامہ بر تھا
کہا، خط کتابت کی عادت نہیں ہے

●

Scanned with CamScanner

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ رابعہ سلطانہ ناشاد کی شاعری ان کے اپنے تجربے کی سچی ترجمان ہے۔ بغیر کسی آرائش اور تقلیدی روئے کے انہوں نے پوری صداقت سے اپنی جذباتی کیفیت کو شعر کا پیرہن عطا کیا ہے۔ سادہ اور پرملال لہجہ دل کے سوز کو بہ خوبی قاری تک پہنچانے میں معاون ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

سعیدہ عروج مظہر

ان کا اصل نام مظہر النسأ تھا۔ سید محمد مرتضیٰ حسین نہاںؔ کی صاحب زادی تھیں۔ ۱؍جنوری ۱۹۲۲ء میں حیدر باد میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ جامعہ عثمانیہ سے فارسی زبان وادب میں ایم اے کیا اور پھر بی ایڈ کرنے کے بعد حیدرآباد گرلز کالج میں فارسی کی لکچرر رہیں۔ اردو، عربی اور فارسی کے ساتھ انگریزی ادب پر بھی گہری نظر تھی۔ ۱۹۴۷ء میں حسن محمود عروج کے ساتھ شادی ہوئی اور کچھ دنوں بعد پاکستان چلی گئیں۔ وہاں بھی معلّمہ کے فرائض انجام دیتی رہیں ۔ ۲۵؍ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۹۸۰ء جنوری کے 'سب رس' کراچی کے یادِ رفتگاں نمبر میں اس شاعرہ پر کئی مضامین موجود ہیں۔

سعیدہ عروج مظہر کی غزلوں کا رنگ عشقیہ ہے لیکن لب ولہجہ اپنے وقت کے لحاظ سے انوکھا ہے۔ اس زمانے میں جب اردو کی شعری لفظیات فارسی زدہ تھی تب انہوں نے عام فہم اور ہندی آمیز لفظیات سے اپنے شعری ڈکشن کی تشکیل کی۔ اور منفرد انداز میں اپنے خیالات وافکار کو دامن میں سمیٹا کہ ان کے اشعار الگ ہی ذائقہ دیتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں:

کج مج راہیں جوں پگڈنڈی پھیلے جال خیالوں کے
زلف کے بل زنجیر کی کڑیاں جیسے جواب سوالوں کے

●

دوب پہ بکھرے شبنم موتی ڈرڈر کے ہم پاؤں دھریں
جیسے کسی نے من بکھرائے ہوں سبزے پہ کالوں کے

Scanned with CamScanner

پیار کا روپ انوپ نرالا سو سو رنگ دکھائے
جیسے دوپٹا قوس وقزح کا آنکھوں میں لہرائے
میرا دل ہے کانچ کا ٹکرا تیرا مکھ سورج کی کرن
ہائے تصور تیرا ظالم میرے دل سے ٹکرائے

●

پی پی پپیہا، کو کو کوئل، چھم چھم رقصاں مور
ایسے میں اے ہجر پلٹ جا اپنا زہر نہ گھول

●

کنگن ہاتھ میں شرماتا ہے سن سن سی ہے کلائی میں
قرب کا ہلکا سا ہے تصور، آگ پہ رکھا پارہ ہے

●

ان اشعار میں صرف لب ولہجہ ہی نہیں بلکہ تخیل کے خوب صورت پیکر بھی دلاویز اور منفرد ہیں۔نسائی نزاکت اور نفاست سے بھرپور جمالیاتی اظہار کے یہ نمونے پرکشش اور من موہنے ہیں۔چند اشعار اور پیش کئے جارہے ہیں جن میں فارسی تراکیب وتلازمات کا استعمال تو ہے لیکن نہ زبان بوجھل ہے اور نہ انہیں محض تقلیدی کہا جاسکتا ہے:

شمع کی لو محرابوں میں پروانوں کی پرچھائیں
تصویر ادراک ہے جیسے چاند پہ سائے ہالوں کے

●

تجدیدِ ملاقات بڑے کام کی نکلی
دیکھا تو جو دوری تھی فقط نام کی نکلی
کچھ ان کا تغافل بھی تھا کچھ اپنا تساہل
اور تھوڑی کسر گردشِ ایام کی نکلی

Scanned with CamScanner

ہے مظہرِ تاثیرِ صداقت بھی خیالی
جو ساری کشش تھی وہ تہہِ دام کی نکلی

●

زخم جاں، سوزِ جگر، اشک فسانی مانگے
دل طلب گارِ فسانہ ہے کہانی مانگے
ہے کوئی شخص جو گم تشنہ جوانی مانگے
قصر تعمیر کرے یوسفِ ثانی مانگے
سانپ کا کاٹا تو پھر بھی سنبھل سکتا ہے
ہجر کی رات جو کاٹے تو نہ پانی مانگے
سایۂ گل میں مری قبر بنا نا او گو
دل ہے خیام بہاروں کی نشانی مانگے

●

سمندر سے قطروں کا ان مٹ ہے رشتہ
تو پھر کیسے تجھ سے جدا ہو گئے ہم

●

جنہیں حوادثِ عالم سکھائے بخیہ گری
وہ اپنا چاک گریباں بھی خود ہی سیتے ہیں

●

یاد کے شیش محل، ان کی بھلا کیا ہے بساط
آئینہ ہاتھ سے اک چھوٹ رہا ہو جیسے

Scanned with CamScanner

ہم دھنک کے رستے سے دور افق کے پار اترے
ہنس کے روح نے پوچھا آپ اِدھر کدھر تنہا

●

جلے نہ دل تو بھلا شعر میں کہاں تاثیر
جو لحن میں نہ لچک ہو تو کیا گداز آئے
بغیر درد کے نغموں میں کیا مزہ مظہؔر
بغیر سوز کے کیا خاک لطفِ ساز آئے

●

مظہؔر کے یہاں پیارے پیارے اور انوکھے شاعرانہ پیکر ہیں جنہیں نئے تلازمات اور تراکیب سے تشکیل دیا گیا ہے۔ جیسے چوٹی کے بل کو زنجیر کی کڑیاں، سبزے پر کالوں کے من کا بکھرا ہونا، پگڈنڈی جیسے خیالوں کے جال، دھنک کے رستے سے افق کے پار اترنا، کلائیوں میں ہوتی سنسناہٹ کو آگ پہ رکھے پارے سے تشبیہ دینا، یہ مثالیں ان کے نازک جمالیاتی تخئیل کی شناخت ہیں۔ ان کے نزدیک شعر کی جان دل کے سلگنے اور لہجے کے گداز میں مضمر ہے۔ سعیدہ عروج مظہؔر اپنی ہم عصر شاعرات میں منفرد مقام کی حامل ہیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ان خوبیوں کے باوجود ادا جعفری جیسی شہرت ان کا مقدر نہیں ہوئی جب کہ دونوں ہم عصر بھی تھیں اور ہجرت کے بعد ایک ہی ملک کی شہری بھی رہیں۔ شاید اس کا بڑا سبب سعیدہ عروج مظہؔر کی کم گوئی رہی ہوگی۔

●●

Scanned with CamScanner

بیگم رضیہ حلیم جنگ

بیگم رضیہ حلیم جنگ کی پیدائش ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد کے ایک ممتاز خاندان میں ہوئی۔ان کے والد مرزا اکبر بیگ پشتینی نواب ہونے کے ساتھ ساتھ نظام حیدرآباد کے سول انجینئرنگ کے شعبہ میں چیف انجینئر تھے۔جنہوں نے ۱۹۱۶ء میں یونی ورسٹی آف مانچسٹر سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔بیگم رضیہ کی والدہ ظفر النساء مشہور ادیب اور محقق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی سگی بہن اور ایک دیندار خاتون تھیں ساتھ ہی خوش الحانی سے تجویدِ قرآن کے لیے بھی حیدرآباد میں شہرت رکھتی تھیں۔جب بیگم رضیہ کی عمر محض آٹھ سال کی تھی تو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔والد نے خانگی پریشانیوں کے سبب ان کا کوئن میریز کانونٹ الہٰ باد میں بنیادی تعلیم کی خاطر داخلہ کروادیا۔

۱۹۳۸ء میں ان کی شادی دہلی کے نواب حلیم جنگ سے ہوئی جو ایڈنبرگ یونی ورسٹی آف برطانیہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی میں اپنی ایک فضائیہ کمپنی اور ریستوراں کے سلسلے کامیابی سے چلارہے تھے۔شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے بیگم رضیہ حلیم جنگ کو بزنس میں شامل کرلیا۔وہ کاروبار کی ذمہ داری سنبھالنے کے ساتھ ہی سماجی کاموں میں بھی یوں مصروف ہوئیں کہ آزادی کے قبل دہلی میونسپل بورڈ کی پہلی خاتون کونسلر بن گئیں۔دریا گنج دہلی میں ان کا گھر ''حمید منزل'' سماجی ،سیاسی ،ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا ایک روشن مرکز تھا کہ جہاں مولانا آزاد، سروجنی نائیڈو، ذاکر حسین، جناح، فخرالدین علی احمد اور فیض احمد فیض جیسی شخصیتیں رونق بخشتی تھیں۔

رضیہ حلیم جنگ کی تخلیقی ہنرمندی کے نمونے ان کے دو شعری مجموعے ''صدائے دل

"(۲۰۱۱ء) اور "میں غریب تو غریب نواز" (۲۰۱۲ء) کی صورت ہیں۔ نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن کو انہوں نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہاریہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول ہے۔ اللہ جو خالقِ کائنات ہے اور رسولِ پاک جو سببِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کو اللہ کی بندگی کرنے اور حضورِ پاک کے امتی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی احساس کے تحت اللہ اور اس کے محبوب رسول کی اطاعت مومنوں کو سر بلند رکھتی ہے۔ ایسے جذبات و احساسات سے لب ریز شاعری کو حمد اور نعت کا نام دیا جاتا ہے۔ حمد خدا کی توصیف اور ثنا سے عبارت ہے تو نعت پیارے رسولِ پاک سے محبت اور عقیدت کا اظہاریہ ہے۔ ایمان اور عقیدت کے گل رنگ جذبوں سے بھرپور ایسے کلام کا حسن الگ ہی مقام کا حامل ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں نعت گوئی کی ایک طویل روایت رہی ہے۔ رسولِ پاک سے والہانہ لگاؤ کا اظہار گرمئی احساس کے ساتھ علمی درک، فکری بصیرت اور تخلیقی ہنر مندی کا متقاضی بھی ہے۔ اور جب کوئی شاعرہ اس موضوع کو برتتے تب معاملہ "بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی" والا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کا جذباتی اور تخلیقی تموج سرحدوں سے بے فکر ہوتا ہے۔

رضیہ حلیم کی شاعری جذبہ واحساس کی سرمستی اور والہانہ سپردگی سے معمور ہے۔ ان کا دل عشق خدا اور رسول پاک کی محبت سے سرشار ہے اور غزلیں ان کے قلبی احساسات کی دلکش ترجمان ہیں۔ عشق کا ایک دریا ہے جو ان کے اشعار میں موج زن ہے۔ جس کی لہریں کہیں تیز تو کہیں سبک رفتاری کا پتا دیتی ہیں۔ اپنے عاشقانہ خیالوں پر انہیں فخر ہے۔ وہ حسنِ ازل پر فریفتہ ہیں۔ ان کا امتیازی وصف ان کا نسائی رنگ لہجہ ہے جو روایتی ڈگر سے الگ ہے۔ چند مثال ملاحظہ ہوں :

تیرا حسن لا زوال / میرا عشق با کمال
اپنے عاشقوں میں لکھ / میرا نام ذوالجلال

●

یہ درودِ عشق کا قصہ جو تیرے نام کروں
شروع کیسے کروں اور کہاں تمام کروں

Scanned with CamScanner

تجھ سے لگن لگی ہے/ پھر مجھ میں کیا کمی ہے

●

گو خوف سے عذاب کے لرزی ہوئی تھی میں
لیکن ترے کرم کو بھی پہچانتی تھی میں
مرتی تھی بار بار گناہوں کے ڈر سے میں
زندہ ہوں اس لیے کہ تجھے سوچتی تھی میں

●

توبہ کے ہیں کچھ پھول تو کچھ اشکِ ندامت
سوغات لیے بیٹھی ہوں آتے ہی نہیں وہ

●

مرا معبود پوچھے گا مری بندی تو کیسی ہے
خوشی سے ناچ کر اس سے کہوں گی خوب اچھی ہے

انہوں نے اپنے اشعار میں وضو، درود، مدینہ، طیبہ، خاکِ مدینہ، زم زم اور کوثر جیسے تلازموں کا منفرد استعمال کیا ہے جو ان کی فکر اور تخئیل کی بلند اڑان کا اشاریہ ہے۔ فکری تموج اور نسائی جذبہ واحساس سے آمیز ان چند اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

بعد از وضو تھا ذکر تمہارا ہی روز و شب
ڈھانپے ہوئی تھی سر میں درودوں کی شال سے

●

لگاؤں خاکِ مدینہ کا سرمہ آنکھوں میں
ہرے لباس سے اپنا بدن سجاؤں میں
کہ جیسے کوئی گھماتا ہے ہاتھ میں کنگن
ترے درود کی تسبیح یوں گھماؤں میں

●

Scanned with CamScanner

زمانے رقص کر لے باندھ لے اب پاؤں میں پایل
ہوا نے آمدِ یٰسین کا مژدہ سنایا ہے

●

ہنس پڑی آہیں مدینے سے وہ سوغات ملی
معجزہ کیا ہے یہاں آکے ہی سمجھا میں نے

●

نبی جی سنو تشنگی کی کہانی
مرے لب پہ ٹپکا دو کوثر کا پانی

●

سرمئہ خاکِ مدینہ جو لگا آنکھوں پر
مثل آئینے کے آنکھوں کے نگینے چمکے

●

ایسا ہو جائے کہ میں خاکِ مدینہ ہو جاؤں
اور میرے لیے اس قرب سے اچھا کیا ہے

●

آج جو چہرے پہ زم زم مل لیا
کس گئیں چہرے کی ساری جھریاں

عاشق کی زندگی میں عشق کے چار مرحلے آتے ہیں۔ پہلا کشش، جب کوئی دل کو شدت سے بھائے، وہ صرف اس کو سوچے اور اسی کے خیالوں میں غرق دنیا سے بے خبر ہو جائے۔ دوسرا مرحلہ جب دید کی تمنا شدید آرزومندی میں ڈھل جاتی ہے، قربِ محبوب کی تڑپ اور اشتیاقِ وصل کی آگ اپنی تپش سے جسم و جاں جلا کر خاک کرنے پر تل جاتی ہے۔ تیسرا مرحلہ فراق یا ہجر کا جب دونوں کے درمیان زمانی اور مکانی فاصلے حائل ہوتے ہیں۔ اور چوتھا مرحلہ ملن کا آتا ہے۔ جب جذبوں کے دہکتے شعلوں پر قرب کی شبنمی پھوار پڑتی ہے جو ایک عمر کی بے قراری اور اضطراب کو

Scanned with CamScanner

قرار بخشتی ہے۔یہی قرار عاشق کے دل و جاں کا سرمایہ ہوتا ہے۔رضیہ حلیم جنگ کے شعروں میں بھی یہ چاروں مرحلے آنسوؤں کے سوز، دل کی تڑپ، جذبوں کی تپش اور تغزل کے تمام حسن کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔:

تم ہو سب سے حسین دنیا میں/آرزو میری تم پہ مر جانا
جو مرا تم پہ جاوداں وہ ہوا/تم پہ مرنا ہے یعنی جی جانا

●

دیکھوں تمہیں میں اس طرح بجھ جائے ساری تشنگی
کوئی نہیں بس آخری چاہت مری تم ہی تو ہو

●

مجھے اک شوق ایسا دے مجھے اک درد ایسا دے
جو تیرا مبتلا کردے جو رازِ عشق سمجھا دے

●

جوڑا ہے میں نے خود کو تمہارے خیال سے
اب تو مرے فراق کو بدلو وصال سے

●

نہ آنسو ہیں نہ آہیں ہیں نہ بیداری ہے راتوں کی
مجھے معلوم ہے کیسے کٹی ہیں ساعتیں میری

●

اس دل سے آرزوئیں تمنائیں سب گئیں
مل جاؤ تم تو سارا زمانہ مجھے ملے

●

میں ایک ذرۂ ناچیز تھی رہی یوں ہی
وہ لوگ تھے جو ترے غم میں بن گئے موتی

●

Scanned with CamScanner

یہ کیسی لو لگی ہے دل کو یہ ہر دم سلگتا ہے
جلی میں اپنے ہی اندر وگرنہ راز کھل جاتا

●

پکارتے ہیں کنارے کھڑے ہوئے ناداں
مجھے تو ڈوبنا ہے ہاتھ کیوں بڑھاؤں میں

●

میں عاشق ہوں تمہارا عشق ہے اک آگ کا دریا
کبھی اس پار جب جاؤں تو بالکل ڈوب کر جاؤں

●

تو بلا تو مجھے میں ناز اٹھاؤں تیرے
سر کے بل چل کے مری جان میں گھر آؤں تیرے

●

کھڑی کھڑی میں ہوئی جو پتھر حضور ان کے تو وہ یہ بولے
کبھی میں آؤں گا تیری جانب ادا تری مجھ کو بھا گئی ہے

●

جبیں کرتی تھی سرافراز اپنی خوب سجدوں سے
تمہارے عشق کی جاناں لگن دل میں کچھ ایسی تھی

●

آ کر مجھے ملا وہ دمِ واپسیں کے وقت
ارمانِ وصل سے تو رہائی مجھے ملی

●

تجھ سے لیا جو اس کی دنیا کو کیوں خبر ہو
آپس کی ہیں یہ باتیں بتلاؤں کیوں کسی کو

●

Scanned with CamScanner

مری طاقت، مری قوت، مرے خوں کی روانی تم
مری سانسوں کی میری روح کی ہو زندگانی تم

●

رضیہ حلیم جنگ کے یہ اشعار جذبِ دروں کی اور سوزِ نہاں کی تپش سے بھرپور ہیں۔ سر کو درودوں کی شال سے ڈھانکے، زم زم مل کے چہرے کی جھریاں دور کرتی اور درود کی تسبیح کو کنگن سا گھماتی اس شاعرہ نے اپنے پاکیزہ محسوسات کو اچھوتے تلازمات کی مدد سے خوب صورت نسائی رنگ عطا کیا ہے جو اردو شاعری میں نئی، منفرد اور گراں قدر ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

اداؔ جعفری

عزیز جہاں بیگم اداؔ ۲۲ راگست ۱۹۲۴ء میں بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ والد محترم قاضی بدرالحسن محکمہ زراعت میں اعلا عہدے پر فائز تھے، ان کے انتقال کے بعد اداؔ کی تعلیم و تربیت والدہ کی نگرانی میں گھر پر ہی ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں انٹرنس پاس کیا جس میں اردو کے مضمون میں خصوصی امتیاز حاصل ہوا۔ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں نورالحسن جعفری سے شادی ہوئی پھر ہجرت کر کے پاکستان چلی گئیں۔

اداؔ جعفری کی شاعری کی ابتدا ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہوئی۔ وہ جدید شاعری کے اس کارواں میں بڑے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ شریک ہوئیں جو بوسیدہ روایتوں کے خلاف بغاوت اور انحراف کا پرچم لے کر بے باک جذبوں کے ساتھ نئی منزلوں کی تلاش میں نکلا تھا۔ اداؔ کے طویل تخلیقی سفر کی داستان ان کے چار شعری مجموعے 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' 'شہر درد' 'غزالاں تم تو واقف ہو' اور 'سازِ سخن بہانہ ہے' میں موجود ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی غزلیں اردو شعریات کی صالح کلاسیکی روایت اور عصری جدت طرازی کے توازن کی خوب صورت مثال ہیں۔ اداؔ وہ پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے ایک عورت کی نظر سے زندگی اور زمانے کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ تخلیقی انفراد کے دلاویز رنگوں سے سجا ہوا یہ منظر نامہ نئے پن اور تازگی کے سبب شاعراتِ اردو کے لیے ایک نئی روایت کا آغاز ثابت ہوا۔

غزل کے صنفی اوصاف مثلاً نفاست، نزاکت، رمزیت اور گداز وغیرہ نسائی مزاج سے بہت مماثلت رکھتے ہیں اسی لیے اداؔ کی جمالیاتی فکر بھی تغزل کے رنگوں میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔ ان کے یہاں نسائی فطرت کی نرمی کے سبب رومانی

Scanned with CamScanner

جذبوں کے اظہار میں گمبھیرتا اور شائستگی نظر آتی ہے۔غزل کی دنیا جس رمزیت اور ایمائیت کی متقاضی ہے، وہ قدریں دلکش انداز میں ان کی غزلوں نمایاں ہیں۔ دبے دبے اشارے، مدھم سرگوشیاں اور سبک لہجے کا آہنگ ان کے جمالیاتی شعور کی پہچان ہے، مثلاً:

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

●

آنکھوں میں روپ صبح کی پہلی کرن کا ہے
احوال جی کا زلفِ شکن در شکن کا ہے

●

لو کے موسم میں بھی دل انداز صبا کا چاہے
بات جس تس سے کرے ذکر تمہارا چاہے

●

در بھی نہیں تھا کوئی دریچے بھی بند تھے
آنکھوں میں جانے کیسی دھنک تھی رچی ہوئی

●

دیر آشنا کلیاں کس سے حالِ دل کہتیں
وہ تو بے خبر گزرا جس کی راہ دیکھی تھی

●

پھر اس کے بعد آدا کوئی شب نہیں آئی
بس ایک نام بیاضِ سحر میں لکھا تھا

●

تمام روشنی مگر ہیں اجنبی یہ راستے
میں اس کی بارگاہ تک بس اپنے خواب لے چلوں

●

Scanned with CamScanner

بے آس ساعتوں میں ترا نام یوں لیا
خوشبو نے جیسے راہِ سفر کا شگوں لیا

●

میں آئینے پہ بھلا اعتبار کیسے کروں
مجھے تو صرف اسی کی نگاہ نے دیکھا

●

رومانی جذبوں سے لب ریز ان اشعار میں لہجے کی کوملتا دل کو موہ لیتی ہے جو قاری کو جمالیاتی کیف عطا کرتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ اشعار اس وقت کہے گئے جب نسائی فکر و شعور اردو شاعری میں مفقود تھا۔ شاعرہ کا یہ قدم نہ صرف ان کی جرأتِ فکر کا ثبوت تھا بلکہ ہم عصر شاعرات کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے جدید اردو شاعری میں ادا جعفری کو خاتون اول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی غزلیں نہ صرف رومانی جذبہ و احساس سے بھرپور ہیں بلکہ عصری اجتماعی مسائل کی پیش کش میں بھی کامیاب ہیں۔ اپنے عہد کے مختلف تجربات و مشاہدات جب ان کے تخلیقی شعور کا حصہ بنتے ہیں تو ایسے اشعار جنم لیتے ہیں جن میں زخمی اور دکھی انسانوں کے دلوں کا درد بھرا ہوتا ہے۔ ادا کی انسانی دردمندی آفاقی ہے لیکن ترقی پسندوں کے برخلاف ان کے لہجے میں جوش و خروش کے بجائے دھیما پن ہے، کانٹا چبھ کر ٹوٹ جانے کا سا درد ہے جس کی کسک ان کے اشعار میں بکھری ہوئی ہے۔ دکھی دلوں کے درد سے جذباتی وابستگی کی چند مثالیں یوں ہیں:

کمہلائے کوئی پھول تو آنچ آتی ہے دل پر
کس جذبۂ بے نام سے وابستہ رہے ہیں

●

شاید ادھر سے قافلۂ رنگ و بو گیا
خوشبو کی سسکیاں ہیں ابھی تک ہواؤں میں

Scanned with CamScanner

بس کہیں فصیلوں پر کچھ نشان باقی ہیں
شہر کس طرح اجڑا آگ تھی کہ دریا تھا

●

جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور
تاروں کی خنک چھاؤں میں وہ لوگ جلے ہیں

●

رنگِ شفق کی دھوپ کھلی تھی قدم قدم
مقتل میں صبح و شام کا منظر جدا نہ تھا

●

کانوں میں گونجتی ہے بڑی آشنا صدا
ویران بستیوں میں غزل خواں کوئی تو ہے

●

بجھی بجھی سی نگاہیں غبار ہے کہ دھواں
وہ راستہ ہے کہ اپنا بھی نقشِ پا نہ ملے

●

یہ بے بسی تو مرے عہد کا مقدر تھی
دلوں کو داغِ تمنا بھی مستعار ملے

●

گلوں سی گفتگو کریں قیامتوں کے درمیاں
ہم ایسے لوگ اب ملیں حکایتوں کے درمیاں

آزادی اور غلامی کے معرکے میں سیاست نے تقسیم کا کانٹوں بھرا تحفہ بھی انسان کو بخشا جس کے نتیجے میں صرف خون کے دریا ہی نہیں بہے بلکہ صدیوں کی گنگا جمنی تاریخ اور تہذیب بھی تاراج ہوئی اور آزادی کے متوالوں کے ہاتھ خالی ہی رہے کہ فایدہ صرف سیاسی ثابت ہوا۔ اس

Scanned with CamScanner

صورت حال نے بے بسی، بے پناہی، ہجرت اور بے گھری کے احساس کو اس عہد کا مقدر بنا دیا۔ ایسے وقت میں حساس فن کاروں نے شعروادب کے دامن میں اپنے اپنے تجربات ومشاہدات پر مبنی احساس وفکر کو پیش کیا جو اس دور کی تاریخی دستاویز بن گئے۔ درج بالا اشعار بھی شاعرہ کے انہی احساسات کے ترجمان ہیں۔ جہاں رنگ و بو کے قافلے گزرنے کے بعد خوشبوؤں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ جلتی بستیوں کا دھواں اور بھاگتے قدموں کی گرد میں راستوں کی شناخت نہیں ہوتی ۔ایسے قیامت خیز ماحول میں آداگلوں سی گفتگو کرتی نظر آتی ہیں کیوں کہ انہیں خبر ہے کہ ان جیسے لوگ کمیاب ہوتے جارہے ہیں جن کے دل انسانی عظمت اور خیر کا گیت گاتے ہیں۔ شاعرہ کی وسیع المشربی، جرأتِ فکر اور دردمندی ان کی تخلیقی شخصیت کی اہم شناخت ہیں۔ جمالیاتی شعور وفکر کی تازگی اور احساس کی شدت لفظوں کے استعمال میں وہ غنائیت بھر دیتی ہے جو اشعار کو انوکھے رنگ و آہنگ سے لب ریز کر دیتا ہے۔ مثلاً:

رات آہستہ گام گزری ہے
درد کے ماہتاب زینوں سے

●

اک عمر کے روپ دیکھتی ہوں
دیوارِ فراق آئینہ ہے

●

پرچھائیں سی میں یہیں کہیں ہوں
دور اک چراغ جل رہا ہے

●

میں رنج کے ساحلوں پہ تنہا
یہ کون مجھ کو پکارتا ہے

●

Scanned with CamScanner

میں حرفِ زیرِ لب تھی اسی نے سنا مجھے
احوالِ جاں کہا ہے نہ درسِ سکوں لیا

●

ہوا کے سامنے شاخِ گلاب جیسی ہو
جھکو تو سر کو اٹھانے کا بھی ہنر رکھنا

●

میں آندھیوں کے پاس تلاشِ صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو مرا حوصلہ ہے کیا

●

بڑی شخصیت اپنے عہد کی شناخت ہوتی ہے۔ ادا جعفری بھی صفِ شاعرات میں نہ صرف خوش قامت ہیں بلکہ جدید شاعرات کی میر کارواں ہیں۔ نسائی وجود کو شاخِ گلاب سے تشبیہ دے کر انھوں اسے فطری لچک اور توانائی کی علامت بنا دیا ہے۔ جھکنے اور سر اٹھانے کے ہنر سے آراستہ یہی حوصلہ آندھیوں کے پاس صبا کی تلاش کرتا ہے۔ پہلی بار اردو شاعری ایک باشعور اور بالغ نظر نسائی شخصیت کی آواز کی گونج سے آشنا ہوئی۔

●●

Scanned with CamScanner

زبیدہ تحسین

۱۹۴۷ء کے آس پاس اردو شاعرات کی جو جماعت سامنے آئی ان میں زیادہ تر ایسی شاعرات ہیں جو ہمت اور بے باکی کے ساتھ ادب کے میدان میں تو آ کھڑی ہوئیں مگر روایت سے الگ کوئی شناخت نہیں بنا پائیں۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ فکر کے اظہار کے لیے نہ صرف موضوع بلکہ اسلوب تک میں روایتی انداز ہی اپنایا۔ جہاں ان کی اپنی انفرادیت اور نسائیت مفقود نظر آتی ہے۔ خاتون خانہ ہونے کے باوجود زبیدہ تحسین کا نام بھی حیدرآباد کی ایک کہنہ مشق شاعرہ کے طور پر نظر آتا ہے۔ شعر وادب سے گہرے لگاؤ کا سبب والد مولوی محمد عبدالکریم صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھی جو خود بھی منشی فاضل اور مولوی کامل ہونے کے ساتھ اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔

زبیدہ تحسین کی شاعری کی ابتدا لگ بھگ ۱۹۴۰ء سے ہوئی۔ اپنے عہد کے رجحانات کے سبب ان کے یہاں زندگی اور زمانے کی عکاسی تو نظر آتی ہے لیکن مجموعی اعتبار سے ان کا رنگِ تغزل قدیم شعری روایت کی بازگشت ہی معلوم ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں کہیں معاشرے کی تلخیوں کا احساس جھلکتا ہے، تو کہیں اس کے خلاف جدوجہد کا رویہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ انہیں انسان کی آزادی سے پیار بھی ہے اور اس کے عزم وحوصلہ پر یقین بھی مگر ایسے خیالات کم ہی شعری صورت لے پائے ہیں:

روشنی کے ہالے میں رقص ہے جنوں پرور
یوں اڑا اڑا لیکن رنگِ گلستاں کیوں ہے

●

Scanned with CamScanner

دشت تو دشت تھا گلشن میں بھی وحشت سی ہے
کارواں کون سی منزل پہ رواں ہے اے دوست

●

ہر گوشہ چمن کا مجھے مقتل سا لگا ہے
ڈھونڈے سے بھی قاتل کا کہیں نام نہیں ہے

●

پھینکی تو ہیں ہم نے بھی ستاروں پہ کمندیں
پرواز ابھی اپنی لبِ بام نہیں ہے

●

ہمیں تو جہدِ مسلسل سے پیار ہے تحسینؔ
عبث ہے دوزخ و جنت بھی اس جہاں کے سوا

●

یوں ہر قدم پہ ٹھوکریں ملتی رہیں مگر
ہم زندگی کو خوابِ پریشاں نہ کر سکے

●

زبیدہ تحسینؔ کی غزلوں میں جذبۂ عشق کی شدت ہے۔ وہ زندگی کو محبت سمجھتی ہیں جو دکھوں سے بھری ہونے باوجود بہت پیاری ہے۔ محبوب کا تصور اور فراق کے لمحے شاعرہ کی اداسی کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے جذبوں کی پیش کش میں شعر کا درد سے پر ہونا لازمی ہے:

تم تصور کے تراشے ہوئے پیکر ہو وہی
جس کو ہر رنگ میں دیکھا ہے سرابوں کی طرح

●

Scanned with CamScanner

ترے خیال کی ٹھنڈک ترے فراق کی آنچ
خوشی کی طرح ترا غم رہا ہے آنکھوں میں

•

زمانے بھر کی نگاہوں کی کیوں رہوں مرکز
فسانے اور بھی ہیں میری داستاں کے سوا

•

وہ ضیا تاب نظارے نہ وہ بھیگی راتیں
چاند افسردہ ہے اب ٹوٹے ہوئے دل کی طرح

•

جس فضا میں تحسینؔ نے آنکھیں کھولیں اور جس ماحول میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اس میں پرانی تہذیب اور قدروں کی شکست و ریخت کا عمل ناہمواری کی کیفیت سے دوچار تھا۔ جس کے سبب ذہنوں پر بے زاری، اداسی اور بے یقینی کے احساسات اپنا رنگ جمانے لگے تھے۔ زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں نے فنکار کو یا تو قنوطیت کی طرف راغب کیا یا پھر ذہنی فرار نے رومان کی وادیوں میں پناہ ڈھونڈی۔ تحسینؔ نے بھی رومانی دنیا کو اپنے تصورات اور کیفیات سے آباد کیا۔ ان کی شاعری کی فضا الم ناک ہے۔ کبھی وہ فطرت کے حسن پر مائل ہوتی ہیں اور کبھی آنسوؤں میں دل پرخوں کا رنگ ملا کر زندگی کے بے رنگ خاکے میں گل بوٹے کھلانے کی کوشش کرتی ہیں:

کتنے بے رنگ سے خاکے میں لہو بھرتی ہوں
دل کی دھڑکن سے مرا رشتۂ جاں ہے اے دوست

•

یہ ہے زخم دل کا عالم کسے کیا بتائیں تحسینؔ
کہیں تارے جگمگائے کہیں چاند مسکرایا

•

Scanned with CamScanner

بجھتے ہوئے چراغ ، کہیں کہکشاں رہے
دھندلا سا اک غبار ، کہیں چاندنی رہی

●

زبیدہ تحسینؔ کی شاعری کی پوری فضا رنج والم سے معمور ہے۔ اس لیے ان کے یہاں ٹوٹے ہوئے دل کا کرب، نارسائی اور محرومی کے جذبات کا بیان ہے۔ روایتی رنگ حاوی ہونے کے باوجود تانیثی فعل کا استعمال حیران کن ہے کہ ان کے ماحول میں عورتوں کا شعر کہنا اور عورت کی حیثیت سے کہنا مستحسن نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایسے میں ان کی یہ فکری جرأت قابل قدر ہے دبے دبے ہی سہی انہوں نے اپنی نسائی شخصیت کو شعر میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ چند مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

میری آنکھوں میں بن گیا کاجل
زلف بن کر سنور گیا کوئی

●

زندگی نے کیا دیا ہے ہے مجھ کو اک غم کے سوا
زندگی میں رنگ بھرنے کب سے مسکاتی ہوں میں

●

سونے سونے من مندر میں کوئی پپیہا آگ لگائے
دیر سے کھوئی بیٹھی ہوں میں جانے کیوں مسکانوں میں

●

تحسینؔ ہو چلا ہے دلِ چاک بھی رفو
تنگ آ چکی ہوں روح کی آشفتگی سے میں

●

نہیں احساس شاید کچھ تمہیں میری وفاؤں کا
کہ دیکھی جب کبھی تم نے فقط تقصیر ہی دیکھی

Scanned with CamScanner

اضطرابِ دل میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہیں
اورسکونِ دل سے بھی جیسے کہ گھبراتی ہوں میں

●

کوئی قیمت نہ سہی اشکِ رواں کی تحسینؔ
انہیں آنچل میں مرے جذب تو ہو لینے دو

●

درج بالا مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زبیدہ تحسینؔ نے پرانی راہوں سے الگ ہٹ کر چلنا چاہا لیکن تہذیبی رواجوں کے بندھن میں جکڑی شاعرہ نے اس رنگ کو نکھارنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید تہذیبی اور معاشرتی احترام نے جرأتِ فکر کے پاؤں تھام لیے ہوں گے کہ یہ عمل روایت سے بغاوت نہ مان لیا جائے۔ اپنے مجموعۂ کلام میں 'کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان کے تحت انہوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر زور مرحوم نے ۱۹۵۶ء میں ان کا یہ مجموعہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر خود شاعرہ کے تغافل کے سبب معاملہ اشاعت تک نہیں پہنچ سکا۔ پھر بھی روایتی رنگِ سخن میں بھی تحسینؔ نے اپنے تصورات و کیفیات کو بخوبی پیش کیا۔ جن کے اثر سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے:

سکوں ملا ہی نہیں دل کو ویسے ہر لمحہ
سکوں سے گزرے جو لمحے تمہارے نام رہے

●

چاہا نہ ہمیں نے ورنہ یہ سب چاند ستارے جھک جاتے
کچھ وجہِ سکونِ دل کے لیے ہم نے وہ سہارا چھوڑ دیا

●

آباد ہے اک درد کی دنیا مرے دل میں
کھلتا نہیں کب اور کہاں چوٹ لگی ہے

●

Scanned with CamScanner

اسے دیکھا اسے سمجھا اسے برتا تحسینؔ
زندگی پھر بھی رہی بند کتابوں کی طرح

●

تم گئے ہو تو زمانہ ہی چھٹا جاتا ہے
زندگی جیسے کہ وابستۂ غم ہے دیکھو

●

ہم تجھ سے دور ہو کے ہوئے ہیں قریب تر
ہر راستے سے ہو کے تری رہ گزر گئی

●

ہولے ہولے کون براجے سپنوں کے سنگھاسن پر
چاندنی جیسے چپ چپ اترے اجلے اجلے دالانوں میں

●

جب بھی قاتل نے لگائی ضربِ کاری ایک اور
اور جینے کے تقاضے معتبر ہوتے گئے

●

بہر کیف زبیدہ تحسینؔ کی غزلیں ان کے حالات کی سچی تصویریں ہیں۔ ان کا احساسِ غم شدید تو ہے لیکن زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ دکھ سہے جانے کے بعد بھی مسکرانے اور زندگی سے آنکھیں ملانے کی جرأت رکھتی ہیں۔ ان کے اپنے تجربوں اور مشاہدوں کا حاصل ان کا یہ شعری سرمایہ ہے جو قابل قدر ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

زہرا نگاہ

زہرا نگاہ کی شاعرانہ شخصیت اردو شعر و ادب کے افق پر اس وقت نمودار ہوئی جب ترقی پسند تحریک کا جگمگاتا سورج اپنی کرنیں سمیٹ رہا تھا۔ مشاعروں نے کم عمری میں ہی زہرا نگاہ کے دل گداز ترنم کے ساتھ ان کی شاعری کو مقبول عام بنا دیا تھا۔ کلاسیکی روایت کی تقلید میں ان کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی جس پر روایتی رنگ تغزل کی گہری چھاپ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ مشاعرے کی دنیا سے آگے کا سفر انہیں نئی فکر اور نئے احساس سے آشنا کراتا ہے۔
زہرا نگاہ کے تین شعری مجموعے اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا 'شام کا پہلا تارا' جولائی ۱۹۸۰ء میں، دوسرا مجموعہ 'ورق' ۱۹۹۸ء میں اور تیسرا 'فراق' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔

زہرا کی ابتدائی غزلوں کا بنیادی مزاج رومانی ہے۔ جہاں ان کے لب و لہجے پر کلاسیکی رنگ کی چھٹا بکھری ہوئی ہے۔ رومانی جذبوں کی پیش کش میں بھی کوئی نیا رنگ نہیں بلکہ بنی بنائی رہ گزر پر چلتے رہنے کا عمل نمایاں ہے۔ شاید اس کا بڑا سبب مشاعرہ بھی ہو۔ یوں بھی جب زہرا نے شعر گوئی کی ابتدا کی تو شاعرات کی صف بہت مختصر تھی۔ زہرا نگاہ کے حصے میں زیب عثمانیہ، حیا لکھنوی اور صفیہ شمیم کی روایت ہی آئی جو قدیم رنگِ تغزل سے عبارت تھی۔ اس طرح انہوں نے بھی وہی راہ اپنائی جو رائج الوقت تھی۔ گو کہ ان سے قبل ہی ادا جعفری کی شاعری نے اپنا الگ رنگ نکھارنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن زہرا کے یہاں ابتدا میں ویسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کی غزلوں میں جذبے کی فراوانی اور احساس کی شدت ضرور جھلملاتی ہے۔ مثلاً:

دامن ہزار چاک، گریباں ہزار وا
یہ دیکھنا ہے کتنا گنہگار کون ہے

Scanned with CamScanner

تری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

●

کیوں گھر کے اب آئے ہیں یہ بادل یہ گھٹائیں
ہم نے تو تجھے دیر ہوئی یاد کیا تھا

●

دل بجھنے لگا آتشِ رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غمِ یار کے ہوتے

ایسے اشعار میں عام عشقیہ مرحلوں اور تجربوں کا بیان ہے جن میں نہ موضوع کا نیا پن ہے اور نہ ہی فکر کی گہرائی بلکہ لہجے میں بھی زہرا کی شخصیت کا پتا نہیں چلتا۔ یہ شاعری روایتی غزل کی پیروی ہی کہی جائے گی۔ ان مثالوں سے قطع نظر وقت کے ساتھ زہرا کا شعور بھی بیدار ہوتا نظر آتا ہے۔ اور یہ احساس بھی سر اٹھانے لگتا ہے کہ وہ ایک نسوانی شخصیت کی مالک ہیں تو ان کے نسائی جذبوں نے بھی اپنے وفور اور وقار کے ساتھ شعر میں اپنی موجودگی درج کرائی۔ اور پھر ایسے اشعار وجود میں آئے :

اپنا ہر انداز آنکھوں کو ترو تازہ لگا
کتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا
میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا' اسے کیسا لگا

●

آنکھوں میں دیدار کا کاجل ڈالا تھا
آنچل میں امید کا تارا ٹانکا تھا
ہاتھ کی بانکیں چھن چھن چھن چھن ہنستی تھیں
پیروں کی جھانجھن کو غصہ آتا تھا

●

Scanned with CamScanner

اس نے آہستہ سے زہرا کہہ دیا دل کھل اٹھا
آج سے اس نام کی خوشبو میں بس جائیں گے ہم

•

تمام لوگوں سے رکھ رکھاو تری ہی چاہت کا تھا سلیقہ
تمام دنیا سے دوستی بھی تری محبت کا واسطہ تھی

•

اب اپنے آپ سے بھی چھپ گئی ہے
وہی لڑکی جو سب کو جانتی تھی

•

عورت کے خدا دو ہیں حقیقی و مجازی
پر اس کے لیے کوئی بھی اچھا نہیں ہوتا
دی جس نے محمدؐ کی رسالت کی گواہی
اب اس کی گواہی کا بھروسا نہیں ہوتا

روایت کے دائرے سے نکل کر جب وہ زمانے کا جائزہ لیتی ہیں تو ترقی پسند شاعری پر نگاہیں ٹک جاتی ہیں۔ تقسیم کا المیہ، فسادات کی ہولناکی، مہاجرت کا کرب، ہم عصر مشینی اور میکانکی زندگی کا انتشار و بحران، غرض سارے جاں کاہ عوامل شاعرہ کی توجہ کھینچتے ہیں اور اس کی فکر کا حصہ بننے لگتے ہیں۔ زہرا کے سامنے زندگی کا وہ منظر نامہ ابھرتا ہے جہاں تمام انسانی رشتے، اخلاقی آدرش اور تہذیبی اقدار مکر و فریب اور ہوس کی بھٹی میں تپتے پگھلتے قطرہ قطرہ بہہ نکلے تھے۔ جہاں تہذیب و معاشرے کا دیمک زدہ کھوکھلا پیکر اپنی بے لباسی پر گریہ کناں تھا۔ اور پھر اپنے عصر کی تازہ خوشبو کشید کرنے کی خواہش شاعرہ کے اندر ہمکنے لگتی ہیں۔ زہرا نگاہ کی دردمندانہ تخلیقی حساسیت نے ان تجربوں کو اشعار میں یوں ڈھالا کہ ان کی شاعری کا رنگ بدلا بدلا سا لگنے لگا۔ روایتی عشقیہ جذبوں سے اوپر اٹھ کر فکر و شعور کی دنیا تک کا یہ ارتقائی سفر ان کی شاعری میں بہت واضح ہے۔ جہاں عصری

Scanned with CamScanner

صداقتیں اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مثال دیکھیں :

ہنستی بستی راہوں کا خوش باش مسافر
روزی کی بھٹی کا ایندھن بن جاتا ہے
دفتر، منصب دونوں ذہن کو کھا لیتے ہیں
گھر والوں کی قسمت میں تن رہ جاتا ہے

●

اب صحرا صحرا کیا گھومیں اب بستی بستی جائیں کیا
جو اپنے گھر میں چھوٹ گیا اب اس کا کھوج لگائیں کیا

●

گھر کے سارے پھول ہنگاموں کی رونق ہو گئے
خالی گلدانوں سے باتیں کر کے سو جائیں گے ہم

●

نشانِ لالہ و گل تم مٹا نہیں سکتے
چمن میں آگ لگی تھی کہ آ گئی برسات

●

دلوں کے زخم چھپاؤ ہنسی کو عام کرو
یہ حکم ہے کہ بہاروں کا احترام کرو
سیاہیوں میں امیدیں نہ راہ کھو بیٹھیں
طلوعِ صبح یقینی ہے فکرِ شام کرو

●

اور ہی طرزِ جفا سیکھیں فلک کی گردشیں
اب وفا بھی منزلِ سود و زیاں تک آ گئی

Scanned with CamScanner

چلو کہ اس جستجو میں نکلیں بہار آخر کدھر سے گزری
کہ اس گلستاں میں رہنے والے تو راہ تک تک کے تھک گئے ہیں

●

کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

ان اشعار کی لطافت اور جاذبیت قاری کو مسحور تو کرتی ہی ہے ساتھ ساتھ ترقی پسند رجائیت کا اثر بھی نمایاں کرتی ہے۔ زہرا نگاہ کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اپنے عصری رنگ و آہنگ کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس مقام پر وہ فیضؔ سے خاصی متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ تشبیہات و تراکیب کی سطح پر بھی ان کے یہاں فیضؔ کی گونج سنائی پڑتی ہے۔ مثلاً ان اشعار میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے :

ہر صبح درخشاں تھا وہی حادثۂ دل
ہر رات منور تھی اسی دیدۂ تر سے

●

جاں دیتے ہیں جاں دینے کا سودا نہیں کرتے
شرمندۂ اعجازِ مسیحا نہیں کرتے

●

اب ذوق طلب وجہِ جنوں ٹھہر گیا ہے
اور عرضِ وفا باعثِ رسوائی ہے دیکھو

●

اے چارہ گرو! یہ رخِ بے داد تو دیکھو
ہم سے وہ ادا ساز نہ خوش ہے نہ خفا ہے

●

اک یہ بھی ادائے دل آشفتہ سراں تھی
بیٹھے نہ کہیں سایۂ دیوار کے ہوتے

Scanned with CamScanner

کب تک جاں کو خاک کرو گے کتنے اشک بہاؤ گے
اتنے مہنگے داموں آخر کتنا قرض چکاؤ گے
کل یہ سمندر خشک ہوا تو طرزِ ندامت کیا ہوگی
کل یہ صحرا گرد ہوا تو کون سے رستے جاؤ گے

درج بالا اشعار میں فیض کے لہجے کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔تراکیب، تشبیہات اور علامات میں بھی کلاسیکی طرز کی ہی چھاپ ہے جو اس بات کا اشاریہ ہے کہ زہرا نگاہ اردو کی قدیم شعری روایت سے زیادہ قریب ہیں۔یوں بھی فنکار نہ اپنی روایت سے غافل ہوتا ہے نہ عصری حسیت سے بلکہ اس کا امتحان یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کے امتزاج اور توازن سے اپنے فن کی تخلیق کرے۔زہرا کے یہاں انفراد کا کوئی رنگ تو نہیں جھلکتا لیکن روایتی حصار سے باہر نکلنے کی کوشش ضرور نظر آتی ہے۔درحقیقت انہوں نے رومانی اندازِ فکر سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اس لیے ان کی غزلوں کا غالب موضوع آرزومندی، جذبے کا وفور اور عشق و محبت کے نشیب و فراز ہیں۔ان کے اشعار میں ناکام عشق کے نوحے نہیں بلکہ سرشاری اور وارفتگی ملتی ہے :

بھولیں اگر تجھے تو کہاں جائیں کیا کریں
ہر رہ گزر میں تیرے گزرنے کا حسن ہے

●

جدائیاں تو یہ مانا بڑی قیامت ہیں
رفاقتوں میں بھی دکھ کس قدر ہے کیا کہیے

●

اک وسعتِ خیال کہ لفظوں میں گھر گئی
لہجہ کبھی جو ہم کو کرم آشنا ملا

●

برسوں ہوئے تم کہیں نہیں ہو
آج ایسا لگا یہیں کہیں ہو

Scanned with CamScanner

یہ اداسی یہ پھیلتے سائے
ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے

●

لبِ گویا تو مل گیا تھا ہمیں
صرف اظہارِ مدعا نہ ہوا
نارسائی مزاجِ دل ٹھہری
ختم کوئی بھی سلسلہ نہ ہوا

●

ہائے وہ بت کہ تراشا تو بہت دھوم مچی
اور ٹوٹا تو کوئی شور نہ اٹھا لوگو

●

خوب ہے صاحبِ محفل کی ادا
کوئی بولا تو برا مان گئے

●

کچھ کہنا جرم ہے تو خطاوار میں بھی ہوں
یہ اور بات میرا کہا وہ سمجھ نہ پائے

●

جس سے کچھ نہ کہہ پائیں جانِ گفتگو ٹھہرے
جس سے کم ملیں اس کو سب سے بیش تر جانیں

زہرا نگاہ کی غزلیں اردو شاعری کی قدیم شعری روایت کی پاس دار تو ہیں ہی لیکن ان کے یہاں عصری سیاست کے رنگ بھی جلوہ گر ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کے سیاسی شعور کو وہ بالیدگی عطا کی جو ان کی شاعری میں دلکش فکری جہت کے طور پر سامنے آئی۔ تقسیم کے سانحے بعد اقتدار کی ہوس، خود غرضی، مفاد پرستی، آفاقی قدروں کا زوال، رشتوں کی تقدیس کی پامالی، نفرت ، خوف، دہشت، انسان کی بے پناہی اور بے یقین مستقبل کے اندیشوں۔ سے لبریز

Scanned with CamScanner

احساسات ان کی غزلوں میں موجود ہیں جو بدلتے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں:

یہ شہر کیسے طلسمات کے نقاب میں ہے
بڑے خلوص سے ہر شخص اک عذاب میں ہے

●

سن ناقصانِ شہر ہوئے وارثِ کمال
آہنگ وحرف دور کہیں نوحہ گر سے ہیں

●

منصف کے لیے اذنِ سماعت پہ ہیں پہرے
اور عدل کی زنجیر میں جھنکار بہت ہے

●

کیوں ساری حقیقتوں کا چہرہ
اک چادرِ وہم سے ڈھکا ہے
کیوں نیند میں لوگ چل رہے ہیں
یہ کیسا ہجومِ بے صدا ہے

یہ اشعار ایک باشعور شاعرہ کی فکری جمالیات کے مظہر ہیں۔ عام فہم الفاظ اور مروجہ شعری آہنگ سے مربوط ان کے اشعار جذبے کے خلوص اور شدت سے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ تراکیب کی سطح پر طرزِ ندامت، لبِ گویا، جانِ گفتگو، غمِ یار، آتش رخسار، نشان لالہ وگل، ذوق طلب، وجہِ جنوں، رخِ بے داد، عرض وفا، سایۂ دیوار، دیدۂ تر، حلق زنجیر، اذنِ گفتار اور تلازمات میں صحرا، سمندر ، بہار، گلستاں، صبح، دامن، گریباں وغیرہ کا مروجہ مفہوم میں ہی انہوں نے استعمال کیا ہے۔ لیکن روایتی شعری مزاج کا مظہر ہونے کے باوجود بھی ان کے یہاں کیف وسرور کی دل آویز اور متاثر کن فضا ہے۔ جذبہ وفکر کی سچائی اور اظہار کی سادگی ان کی غزلوں کی جان ہے، جو لائق تحسین ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

ساجدہ زیدی

ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹنے اور جدیدیت کی کونپل پھوٹنے کے زمانے میں ساجدہ زیدی اردو شعر وادب کے کارواں میں بڑے وقار کے ساتھ شریک ہوئیں۔ان کی ولادت ۱۸رمئی ۱۹۲۷ء میں میرٹھ میں ہوئی۔علی گڑھ سے ایم اے اور لندن سے ایم فل کرنے کے بعد وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تعلیم میں پروفیسر رہیں اور سبک دوش بھی ہوگئیں۔

ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار شاعری ،ناول ، ڈراما اور تنقید جیسی اصنافِ ادب میں ہوا۔ان کی ادبی خدمات پر انہیں یوپی اردو اکیڈمی ، بہار اردو اکیڈمی ،میر اکیڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنے ایوارڈ سے نوازا۔ ان کی شاعری کا ترجمہ انگریزی ،ہندی ،اڑیا ،مراٹھی اور روسی زبان میں ہوا۔ان کے چار شعری مجموعے 'آتشِ سیال' 'سیلِ وجود' 'آتشِ زیرِ پا' اور 'پردہ ہے ساز کا' شائع ہوکر اردو شعر وادب کی دنیا میں مقبول ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ دو ناول 'مٹی کے حرم' اور 'موجِ ہوا پیچاں' بھی سراہے گئے ہیں۔ایک نثری ڈراما 'چاروں موسم' اور ایک شعری ڈراما 'سرحد کوئی نہیں' کے ساتھ تنقیدی کاوش 'تنقیدی بصیرت' ساجدہ زیدی کی فکر وشعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔

آزادی کے قبل مارکسی نظرات پر مبنی ترقی پسند تحریک فنکاروں کے خوابوں اور جہد وعمل کی شاہراہ تھی ۔مگر تقسیم کے سانحۂ عظیم کے بعد موت کی دہشت ،درندہ صفت انسانوں کی بربریت ،قدروں کے بحران اور ذہنی انتشار نے بے سروسامانی کے ماحول میں فنکار کو اپنی ذات میں سمٹنے پر مجبور کردیا۔جدیدیت اسی داخلی اور انفرادی ذات کی تلاش سے عبارت ہے۔شعر وادب اپنے عہد کے تناظر میں فنکار کے فکر وخیال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ساجدہ زیدی ایسی ہی ایک شاعرہ ہیں جن کے یہاں جدیدیت کے میلانات ورجحانات کے واضح نقوش دکھائی دیتے ہیں۔گو کہ ان کی

Scanned with CamScanner

شاعری کا بیش تر حصہ نظموں پر مشتمل ہے اور غزلوں کا سرمایہ کم ہے۔ لیکن اپنے عصری مزاج کی نمائندگی کے باعث وقیع حیثیت کا حامل ہے۔

اردو شعروادب کی کلاسیکی تاریخ کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے سبب مغربی افکار ورجحانات اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی شاعری میں جدید ادبی تقاضوں اور فن کارانہ ذمہ داریوں کا گہرا احساس ملتا ہے۔ عصری حسیت کو انہوں نے اپنے تخلیقی تجربوں اور جمالیاتی آہنگ کی آمیزش سے شعریت کا حسن عطا کیا ہے۔

ساجدہ زیدی کی غزلیں حکایتِ غم سناتی ہیں۔ غم جو آفاقی ہے، بے کراں ہے اور کائناتی صداقت ہے۔ شاعرہ کا غم روایتی غم سے مختلف ہے۔ ان کی شاعری میں یہ نہ صرف ذات کی تنہائی کا المیہ ہے بلکہ مجروح انسانیت کا نوحہ بھی ہے اور کھنڈر بنتی صدیوں کی تہذیب کا ماتم بھی ہے۔ ان کیفیات واحساسات کی پیش کش میں لہجے میں ملال اور سوز کی گھلاوٹ ہے۔ جراحتوں کے موسم نے کیا کیا زخم کھلائے ہیں کہ جن کے بیان پر قلم خوں روئے۔ وفورِ غم کی شبنم سے بھیگے اشعار دیکھیے :

وہ نظر عکس تھا جس میں کئی دنیاؤں کا
ٹوٹے آئینے کا انبار نظر آتی ہے
رختِ دل، صحبتِ غم، معبدِ جاں خاک بسر
زندگی بر سرِ پیکار نظر آتی ہے

●

جلتے بام و درو دیوار، سلگتے ہوئے شہر
جن سے پتھرا گئی آنکھیں وہ سماں دیکھے ہیں
وہ حکایات رقم کیں کہ قلم خوں رویا
ہر رگِ تاک میں زخموں کے دہاں دیکھے ہیں
نغمہ وشعر و زباں اہلِ سیاست کے قتیل
پوری تہذیب کے مٹنے کے نشاں دیکھے ہیں

Scanned with CamScanner

نہ نظر میں آگ جلتی نہ لبوں پہ حرف آتا
نہ نقابِ غم اٹھاتے نہ صلائے عام کرتے
یہ جراحتوں کے موسم ، یہ وفورِ غم کی شبنم
یہی زادِ راہ لے کر سفرِ دوام کرتے
سرِ بزمِ دوستاں بھی نہ کھلی زباں ہماری
ارے رنج نارسائی تجھے کیسے عام کرتے

●

جب گنوا آئے متاعِ ہستی
تب ہمیں جاں کا ضرر یاد آیا

●

سب نجومِ شباں چھوڑ کر چل دیے
بجھ گئی ذہنِ بیدار کی کہکشاں

●

اے عمرِ رواں کاسۂ جاں اب بھی ہے خالی
اک دردِ دل اپنا ہے، سو وہ تیری عطا ہے

●

بے سروسامانی، اور کسمپرسی کے ماحول نے بے یقینی، لاحاصلی اور تشکیک کے احساس کو جنم دیا۔ اور پھر تنہائی اس عہد کا مقدر بن گئی۔ انسان اپنی ذات کے خول میں قید ہونے لگا۔ آبادی کے اُمڈتے سیلاب کے باوجود دردآشنا اور ہم زباں نایاب ہوگیا۔ کوئی ایسا نہیں جو دوسرے کا دکھ بانٹ لے۔ بس ایک مہیب سناٹا جو روح کو کچلتا رہتا ہے۔ ایسے میں شاعرہ کے دل میں بھی کسی کے قرب کی خواہش جاگتی ہے جس کی آواز خاموشی کی چٹان توڑے، جو تاریک راستوں میں اجالا بھر دے اور تنہائی کے سفر میں ساتھ نبھائے۔ ایسی شدید آرزومندی کرب بن کر شعر میں ڈھل جاتی ہے تو بے ساختہ توجہ کھینچ لیتی ہے:

Scanned with CamScanner

زرد لمحوں کی اڑتی ہوئی دھجیاں
آسماں سے برستی ہیں تنہائیاں

●

یہ جاگتی ہوئی آنکھوں کی لو ڈراتی ہے
مری شبوں سے کسی خواب کا گزر ہوتا

●

جاؤں یہ حرفِ شوق کہیں اور آزماؤں
اس بزم تو کوئی مرا ہم زباں نہیں

●

تیرگی بڑھتی ہے نورِ رخِ یار آ جائے
دل کے سناٹے میں پھر صورت ہزار آ جائے
پھر بجھا دو مرے ہونٹوں پہ سلگتے نالے
پھر وہی جام پلاؤ کہ خمار آ جائے

●

ہر سانس انتظار ہے ہر گام اضطراب
شاید بلا رہی ہے تری رہ گزر مجھے

●

یہ کڑا سفر گزرتا یہ شبِ دراز کٹتی
کوئی حرفِ وعدہ ہوتا کہ سحر کو شام کرتے

تنہائی کا یہ موسم ساجدہ کو اپنی ہی ذات کے سفر پر لے جاتا ہے۔ پر شکوہ ماضی کے کھو جانے اور ان دیکھے مستقبل کو پالینے کی خواہش میں زندگی تلاش و جستجو کا ایک دراز اور بے انت سلسلہ بن جاتی ہے۔ آبلہ پائی دشتِ امکاں میں لہو کے گل بوٹے کھلاتی ہے۔ روز و شب کے گزرنے کا احساس فنا ہو جاتا ہے۔ جنون شوق اور وحشتِ دل کے سامنے فاصلے بھی سپر ڈالنے لگتے ہیں :

یہ دشتِ جاں کی مسافت مہیب تر ہوتی
اگر نہ رشتۂ احساس معتبر ہوتا

Scanned with CamScanner

عجب میری سرشتِ درد نے افتاد پائی ہے
کہ ہر خارِ رہِ منزل تقاضہ ہو گیا ہم کو

●

اچھا ہی ہے جو مل نہ سکا چارہ گر مجھے
ہونا پڑا کسی کا نہ دریوزہ گر مجھے
گو کانپتا تھا حلقۂ زنجیر میں قدم
جوئے طلب نے دے دیا حکمِ سفر مجھے
ہر خارِ رہ الجھتا ہے دامانِ شوق سے
لے جائے گی یہ آبلہ پائی کدھر مجھے

●

سوئے مہ وستارا ہے چشم نظارہ جو
منزل مری نگاہ کی یہ خاک داں نہیں

●

مرا شوق فزوں خود بن گیا زنجیر پا میری
تقاضہ عشرتِ منزل نے یوں کیا کیا مجھ سے

●

دوستو پائے تمنا کو کہاں لے جائیں
راہ ہر کوچۂ اغیار نظر آتی ہے

ان صعوبتوں اور تمام کلفتوں کے باوجود ساجدہ کے دل میں جذبۂ عشق کا چراغ روشن رہتا ہے۔ ان کی شدید داخلیت اسی فطری جذبے کی دین ہے۔ یہ آفاقی اور والہانہ جذبہ حسیاتی پیکروں میں ڈھل کر بڑی دلاویزی سے شعر کے کینوس پر جگمگاتا ہے۔ پرکیف جذبات وکیفیات جب جمالیاتی تجربوں سے گزرتے ہیں تو رعنائیوں سے بھرپور ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں:

کیفِ جاں نور بصر یاد آیا
عرصۂ حرف و ہنر یاد آیا

Scanned with CamScanner

پھر بجھے دیپ کئی پلکوں پر
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر ہوا دل میں خیالوں کا ہجوم
پھر ہمیں سلکِ گہر یاد آیا

●

وہ ترے دیدہ ولب کی کیفیتیں
رنگ اور نور کا جیسے چشمہ رواں
لے گئیں لوٹ کر ساز وسامانِ دل
ایک لمحے کی جاں سوز برنائیاں

●

کچھ ملتفت ہوئی ہے نگہِ ناز فتنہ ساز
کچھ مئے کدے میں روشنی آئی نظر مجھے

●

رگِ جاں تک میں در آیا کوئی نشہ کوئی نالہ
الٰہی چاند کے ساغر میں یہ کیا دے دیا مجھ کو

●

ساجدہ زیدی کا کمال یہ ہے کہ غموں شدت کے باوجود لہجہ انفعالی نہیں۔ ماضی کی عظیم تہذیبی روایت کے لٹ جانے پر گریہ کناں تو ہیں مگر نئے مستقبل کی تلاش میں ان کا شعور سرگرم سفر رہتا ہے۔ جدید رجحانات سے انسلاک کے باوجود تخلیقی توانائی کا تحرک ترقی پسند خیالات سے فکری وابستگی کا پتا دیتا ہے۔ ان کا جمالیاتی شعور عصری تنہائی کو جو شاعرہ کی ذات کا بھی مقدر ہے، کھنڈر اور دشت کی تہہ دار علامت میں سمو دیتا ہے:

دور تک ایک کھنڈرات کا سلسلہ
رک گیا ہے کہاں عمر کا کارواں

Scanned with CamScanner

قافلے والے نہ سمجھے مری آوازِ درا
دشتِ تنہائی میں نالندہ رہی ذات مری

●

ہم ہی گم ہو گئے اس دشت کی پہنائی میں
آتی اب کوئی صدا دل کے دبستاں میں نہیں

●

کس کی آوارگیٔ شوق یہاں بھٹکے گی
دشتِ تنہائی میں گونجی تھی صدا میرے بعد

●

مدت سے دل و جان و نظر سب ہیں بیاباں
ہم جس کو مکاں کہتے ہیں وہ ایک کھنڈر کیا

●

بہر کیف ساجدہ زیدی کی غزلیں قدیم اردو شعری روایت اور جدید عصری رجحانات کی خوب صورت آمیزش پیش کرتی ہیں۔ پرانے تلازمات اور استعاروں کو معنویت کی نئی جہات سے آشنا کرانے میں ان کی فکری آگہی، دردمند شخصیت اور جمالیاتی بصیرت کا کمال ہے۔ تخئیل کی بلندی، احساس کی شدت اور شعری روایت کا رچا ہوا شعور ان کی غزلوں میں سوز و گداز بھر دیتا ہے۔ اسی سبب صفِ شاعرات میں بلند قامتی ان کی شناخت ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

وحیدہ نسیم

وحیدہ نسیم کی ولادت ۹/ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں حیدر آباد دکن میں اور وفات ۲۸/ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں کراچی میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں اورنگ آباد ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا اور ایم ایس سی تک کی تعلیم عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۹ء سے شعر گوئی کی ابتدا کی جب وہ آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھیں۔ ان کی پہلی نظم رسالہ 'شہاب' حیدر آباد میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ ان کے نانا مولوی اعجاز حسین اعجاز بھی اپنے وقت کے مشہور شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ شاعرہ کو اس بات کا ملال رہا کہ نانا کے وفات پا جانے کے سبب انہیں ان سے استفادہ کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ نسیم کی والدہ شمع اعجاز بھی اپنے دور کی نثر نگار رہی ہیں۔ گویا گھر کے علمی اور ادبی ماحول نے ان کے ذوق وشوق کو جلا بخشی۔ نسیم سائنس کی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اردو شعر وادب سے نہ صرف گہرا لگاؤ رکھتی تھیں بلکہ اپنے فکر و خیال کے اظہار کا معتبر وسیلہ بھی سمجھتی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی چلی گئیں اور وہاں سائنس کی معلمہ کے طور پر اپنی خدمت دیتیں رہیں۔ شعر وادب کی دنیا سے بھی ان کا ان رابطہ بنا رہا۔ گوکہ شعر گوئی میں مستقل مصروف رہیں لیکن پہلا مجموعہ 'موج نسیم' ہے جو ۱۹۷۴ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ جس میں خارجی زندگی کے موضوعات پر کہی گئیں اٹھائیس نظمیں 'بوئے گل' کے عنوان سے شامل ہیں جیسے غالب، ٹیپو سلطان، بہادر شاہ ظفر، اقوام متحدہ، قائداعظم، جامعہ عثمانیہ وغیرہ۔ جن کے بارے میں اپنے پیش لفظ میں خود لکھا کہ یہ نظمیں اس لیے کہی گئیں کہ آئندہ نسل اپنی تاریخ اور ثقافت سے آگاہ رہے۔ 'نالۂ دل' کے باب میں گیارہ نظمیں موجود ہیں جو شاعرہ کے باطنی احساسات کی ترجمان ہیں مثلاً تنہائی' اندھیری رات' کہو کیا جواب دوں؟' اداس شامیں وغیرہ۔ 'دودِ چراغ محفل'

Scanned with CamScanner

کے تحت پچپن غزلیں پیش کی گئی ہیں جن میں غمِ ذات کے ساتھ غمِ زمانہ کا تفکر شاعرہ کی عصری آگہی اور جمالیاتی شعور کی ہم آہنگی کا مظہر ہے۔

وحیدہ نسیم کی غزلیں موضوعاتی اعتبار سے زندگی کے کرب، ماحول کی الجھن اور حالات کی ناسازگاری کو پیش کرتی ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے عروج کی شاعرہ ہیں اس لیے ان کے یہاں زمانے کا دکھ سمٹا ہوا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد غیر یقینی صورتِ حال دیکھ کر وہ بھی حصول آزادی کے جشن پر سوال اٹھاتی ہیں:

ہم تیرہ شبی کے ماروں کو انجامِ سحر معلوم نہ تھا
تھی شامِ غریباں جس میں نہاں وہ صبحِ درخشاں دیکھ چکے
ہر نخلِ چمن کو فکر ہے یہ، آئینِ بہاراں کیا ہوگا
جھونکوں سے نسیمِ صبح کے جب غنچوں کو پریشاں دیکھ چکے

●

کسی نے ہائے نہ پوچھا گلوں پہ کیا گزری
بہار بن گئی دردِ خزاں سنا میں نے

●

بجھا کے آتشِ گلشن نہ ہم نے سوچا تھا
دلوں کی آگ میں جلتے رہیں گے کاشانے

●

ماحول پہ گہری خاموشی، ہر سمت بھیانک تاریکی
تخریب کے ساماں ہر سو ہیں تعمیر کے ارماں رہنے دو

●

مآلِ جشنِ بہاراں نہ پوچھئے ہم سے
یہ ہے وہ آتشِ گل جس سے صحنِ باغ جلے

ایسے ماحول میں شاعرہ کی درک نگاہی نئی صورتِ حال کو شاعرانہ آہنگ دیتی نظر آتی ہے۔ انسانی خون کی ہولی کھیل کر کامیابی کا جشن منانے والے آزادی کے وہ متوالے نہیں جن کی

Scanned with CamScanner

برسوں کی جدوجہد نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹا۔ بلکہ انسانی جذبے سے عاری یہ وہ خود غرض لوگ تھے جو تاج و تخت کو اپنا حق اور زمین کو اپنی جاگیر سمجھ کر قابض ہونا چاہتے تھے۔

جو معصوم ذہنوں میں زہر گھول کر ماحول کو پراگندہ کر رہے تھے اور گندی سیاست کی آنچ میں اپنی ہانڈی پکا رہے تھے۔ ایسے لوگ سرحد کی دونوں جانب فعال تھے۔ تسنیم نے ایسے لوگوں کی عیاری، مکر و فریب اور سیاسی بازی گری کو اپنے اشعار میں یوں پیش کیا ہے:

خدا کی شان کہ بادِ سموم کے جھونکے
چمن میں آ کے بہاروں کے راز دار ہوئے

●

ازل طلسم انہیں کا ابد انہیں کا فسوں
کہاں حیات ہمیں لائی آگہی کے لیے

●

رہا نہ ایک تبسم بھی گلستاں کے لیے
چمن کی ساری بہاریں ہیں باغباں کے لیے

●

فسادات کی ہولناکی اور وحشی انسانوں کی بربریت نے آزادی کا خواب دیکھنے والی آنکھوں کو تہذیبی اقدار اور آفاقی انسان دوستی کے تصورات کو بے حرمتی اور پامالی کا منظر نامہ بنا دیا۔ جن میں خوش کن تعبیروں کے بجائے انسانی لہو کا موجیں مارتا دریا اور سلگتے آشیانوں کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ نفرت، دہشت، بے پناہی اور وحشت کے ساتھ بے گھری اور در بدری کا دکھ دل و دماغ میں جا گزیں ہو گیا تھا۔ تقسیم کے سانحہ نے صرف ہجرت کا کرب ہی نہیں دیا بلکہ دونوں ملکوں کی عوام کے سامنے بے سمت، بے ٹھکانہ اور بے یقین مستقبل کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا۔ اونچے آدرشوں کے ٹوٹنے اور بکھر جانے کا ردِ عمل دانشوروں اور فنکاروں پر ہونا لازمی تھا۔ اس موضوع کو ہم عصر شعراؔ نے بھی برتا ہے اور تسنیم نے بھی دروں بینی سے ان سچائیوں کا سماجی تجزیہ پیش کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

مہاجروں کی مناسبت سے 'کارواں' اور مذہبی بنیاد پر منقسم دوملکوں کی نسبت سے 'دیر وحرم' کے خوب صورت تلازمے ان کی غزلوں میں بھرپور معنی کو روشن کرتے ہیں۔ اجنبی راستوں پر سفر کرتے لٹے پٹے انسانی قافلوں پر منزلوں تک پہنچنے کے خواب نے کیا کیا خونی رنگ دکھائے، اس کا درد تسنیم کے اشعار میں موجزن ہے:

اجڑی ہوئی بستی کے منظر کچھ اور عیاں ہو جائیں گے
اس خانۂ دل پر رحم کرو یاں جشنِ چراغاں رہنے دو

●

ملے ہو آن کے منزل پہ کیا خبر تم کو
جو کارواں پہ سرِ رہ گزار گزری ہے

●

نئے راستے نہ ڈھونڈے کہیں ان کی خستہ پائی
جنھیں لوٹ کر نہ پوچھا کبھی میرِ کارواں نے

●

تسنیم اس کارواں کی منزل مقصود کیا ہو گی
غبارِ راہ ہنستا ہو جہاں خونِ شہیداں پر

●

لٹتے رہے اسیرِ شبِ تار راہ میں
جلتے رہے چراغ مگر کارواں سے دور

●

تسلی دے رہا ہے ہم کو میرِ کارواں پیہم
غبارِ راہ ہے لیکن پریشاں دیکھیے کیا ہو

●

تسنیم قافلے والوں سے کوئی یہ پوچھے
یہ کیا ہوا سرِ منزل جو سر جھکا کے چلے

Scanned with CamScanner

اٹھ اٹھ کے پوچھتا ہی رہا راہ کا غبار
کہتا مگر یہ کون لٹا کارواں کہاں

●

یہ وہ قافلے ہیں ہمدم کہ نہ پوچھ جن سے منزل
نہ بتا سکیں گے یہ بھی کہ چلے تھے یہ کہاں سے

کارواں سے منسلک تلازموں میں قافلہ، رہ گزر، غبار، آبلے، منزل اور چراغ وغیرہ قابلِ توجہ ہیں جن کی مدد سے شاعرانہ تفکر کا شعر میں ڈھل گیا ہے۔ بھلے ہی وحیدہ نسیم نے تقسیم کے فوراً بعد پاکستان جانے والے جتھوں کی مانند مادرِ وطن سے ناتا نہیں توڑا مگر شادی کے بعد پاکستان رخصت ہونا، ہجرت کے دکھ کو ان کا مقدر بھی بنا گیا۔ بالخصوص وہاں کی صورتِ حال دیکھ کر انہیں دیارِ ہند کی یادیں ملول کرتی رہیں۔ وہاں کے سیاسی منظر نامے میں کبھی جمہوریت کے نام پر ملاؤں کی دہائی اور کبھی فوجی آمریت کی گرفت میں رہا۔ ایسے ماحول میں شاعرہ کے اندر نارسائی اور بے حاصلی کا درد سوا ہو جاتا ہے اور ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں:

لپٹ کے پیروں کے آبلوں سے کہا تھا خاکِ وطن نے ہم سے
جسے رگِ گل سمجھ رہے ہو، تمہارے حق میں وہ خار ہوگی

●

نظر بے نور دل بے سوز، سجدے بے حضور ان کے
حرم والوں کے دامن میں بجز داغِ ریا کیا ہے

●

اے باغباں بتا یہ قفس ہے کہ آشیاں
گھٹتی ہے سانس اور ہوا کا گزر نہیں

●

جو دیے بجھا کے اپنے تری انجمن میں آئے
وہ چراغ لے کے ڈھونڈیں کہ کہاں یہ روشنی ہے

Scanned with CamScanner

چلے تھے جانبِ منزل تو کس نے سوچا تھا
وہاں ملیں گے نہ تنکے بھی آشیاں کے لیے

●

کچھ داغ ہیں دردِ فرقت کے، کچھ زخم ہیں رنج غربت کے
ہم تیرے چمن میں صورتِ گل ہنستے ہیں مگر مسرور نہیں

●

یہ قدم قدم پہ بندش یہ روش روش پہ پہرے
کہ نہ رو سکے لپٹ کے کوئی خاکِ آشیاں سے

●

ہر ایک گام پہ سجدہ یہاں روا ہو گا
خودی کا دور ہے ہر شخص اب خدا ہو گا
تمہارے شہر میں آئے ہیں اہلِ غربت پھر
اس آس پر کہ کوئی درد آشنا ہو گا

●

وحیدہ نسیم کے ترکِ وطن کا جو بھی سبب ہو مگر سچائی یہ ہے کہ وہ دیارِ ہند کی یادوں کو دل میں سنجوئے رکھتی ہیں۔ حرم اور دیر جیسے الفاظ ان کے یہاں محض کلاسیکی روایت کی تقلید کے طور پر نہیں آئے بلکہ اپنے عہد کی حسیت کو سمیٹے ہوئے دو الگ ملک اور دو الگ قومی جذبہ و فکر کی علامت بن گئے ہیں۔ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں جو شاعرہ کی فکری جولانیوں اور دردمندانہ شخصیت کا مظہر ہیں:

پھر رشتہ ہائے دیر و حرم یاد آ گئے
سجدہ کیا جو ہم نے صنم یاد آ گئے

●

نظر اسیرِ صنم ہے جبیں رہینِ حرم
یہی ہے شیوۂ ایماں تو کافری کیا ہے

Scanned with CamScanner

حرم تعمیر کر ڈالے ہیں ہر ہر گام پہ لاکھوں
دیارِ ہند کے لیکن وہ مئے خانے نہیں بھولے

●

ہر ایک گام پہ پوجے جنھوں نے لاکھوں بت
وہی حرم کے بنے پاسباں سنا میں نے

●

ان بتانِ حسن کی تخریب بھی تعمیر ہے
بن گئی کعبہ اگر بگڑی صنم خانے کی بات

ان اشعار سے ہم عصر سیاست کا چہرہ جھانک رہا ہے جب اقتدار کی باگ اپنے اپنے ہاتھوں میں تھامنے کے جنون نے ایک دھرتی کے دو ٹکرے کروا دئے۔اور اسی تخریبی فیصلے کے سبب ایک الگ ملک کی نئی تعمیر ہوئی۔پھر نگہبانی اور پاسبانی بھی انہیں کی ذمہ داری ٹھہری جو ارض ہند کے پرستاروں اور جاں نثاروں کی صف میں شامل تھے۔اپنے ماحول سے ذہنی وابستگی وحیدہ نسیم کے دانشورانہ شعور اور بصیرت کی مثال ہے۔اپنے فکر وخیال کی وضاحت کرتے ہوئے 'میری شاعری' کے عنوان سے اپنے مجموعۂ کلام 'موجِ نسیم' میں لکھتی ہیں کہ :

''میں نے اپنی شاعری میں غزل گوئی کا سہارا ہی لیا ہے جہاں ماحول کے کرب کو شاعری میں سمونے کے لیے ایمائیت ناگزیر تھی۔اس بنا پر میری غزل میں لب ورخسار، شانہ وگیسو کے تذکروں کے بجائے اس وقت اور اس دور کی 'کیفیات' کے گہرے نقوش ملتے ہیں جس میں ہم پاکستان بننے کے بعد برسوں مبتلا رہے۔'' ص:۷

اس اقتباس کی روشنی میں ان کے فکری اضطراب اور تخلیقی تقاضوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے تغزل کی کلاسیکی روایت کا خیال رکھتے ہوئے زمانے کی پیچیدگیوں اور مسئلوں کے درمیان کہیں کہیں ذاتی باطنی جذبات وکیفیات کو بھی شعر میں پیش کیا ہے جن پر فطری رومانیت کی ہلکی ہلکی مگر دلکش چھاپ ہے:

Scanned with CamScanner

ابتدا تم ہو انتہا تم ہو
ہم تو ہیں زیبِ داستاں کے لیے

●

بچھڑ کے سارے زمانے سے تم کو پایا ہے
بچھڑ کے رہ گئے تم بھی اگر تو کیا ہوگا

●

تمہاری شکل بھی دھندلا گئی نگاہوں سے
بھرے ہوں آنکھ میں آنسو تو کیا نظر آئے

●

تمہیں گلہ ہے ادا ناشناس دنیا سے
ہمیں بھی غم ہے کہ اپنا مزاج داں نہ ملا

●

ہم اجنبی ہیں آج بھی اپنے دیار میں
ہر شخص پوچھتا ہے یہی، تم یہاں کہاں ؟

بہر کیف وحیدہ نسیم کی غزلیں اپنے عہد کی سوچتی اور بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ اسلوب کی سطح پر ان کے یہاں ترقی پسند شعرا کے لہجے کی جھلک نمایاں ہے۔ علامات اور تلازمات اپنے مخصوص عہد کی ترجمانی میں کامیاب ہیں لیکن باوجود دانشورانہ شعور و فکر اور عصر شناس دیدہ وری کے نسیم اپنا منفرد لہجہ نہیں بنا پائیں جو اردو غزل میں ان کی فطری نسائی اور جمالیاتی تخلیقی شخصیت کی نمائندگی کرتا۔ پھر بھی وہ اپنی تازگئی فکر اور پر اثر شاعرانہ آہنگ کے سبب ترقی پسند شاعری کی رہ گزر سے کامیاب گزری ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

ممتاز مرزا

ممتاز مرزا کی پیدائش ۲۰ جولائی ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ وہ مولانا الطاف حسین حالی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس طرح شاعری انہیں ورثے میں ملی۔ ۱۹۴۹ء میں ان کی شادی اخلاق مرزا سے ہوئی۔ وہ نہ صرف ایک معروف ومقبول شاعرہ تھیں بلکہ ایک ڈراما آرٹسٹ، آکاشوانی کی اناؤنسر اور سنجیدہ صحافی بھی تھیں۔ وہ 'ہندوایران' سہ ماہی رسالہ کی مدیر بھی رہیں جو انڈو ایران سوسائٹی کے دفتر سے شائع ہوتا تھا۔ وہ اس سوسائٹی اور دولی اردو اکیڈمی کے بنیاد گزاروں میں سے تھیں۔ انہوں نے پاکستان، ایران، امریکا اور انگلینڈ کے کئی شہروں کے کامیاب مشاعروں میں شرکت کی۔ وہ اردو کی واحد شاعرہ ہیں جنہیں ۱۹۷۶ء میں پدم شری اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں ہی ان کا مجموعہء کلام 'یادوں کے سائے' شائع ہوا جسے ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی، دہلی نے ایوارڈ سے نوازا۔ ایک طویل عرصہ تک انہوں نے 'خانہ فرہنگِ ایران' (ایرانی سفارت خانہ) میں فارسی کی تدریس کے ساتھ ساتھ ناظم اور لائبریرین کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔

ممتاز مرزا آزاد ہندوستان کے شعری افق پر اپنی چمک بکھیرنے والی ایک مشہور خوش گلو شاعرہ تھیں۔ جب کہ اس سواد میں نیاز فتح پوری، فراق اور جگر کے نام کے چراغ جگمگا رہے تھے۔ ایسے ماحول میں ایک مترنم شاعرہ کی بھرپور پزیرائی یقیناً ان کی قابل قدر صلاحیت کے سبب ہوئی اور خوب ہوئی۔ قدیم شعری روایت کی تقلید کے باعث کلاسیکی رنگِ تغزل ممتاز کی شاعری کی خصوصی شناخت ہے۔ تخلیقی آگہی اور بالیدہ جمالیاتی شعور نے ان کے شعری سرمائے کو محض روایتی نہیں ہونے دیا بلکہ طرزِ اظہار کی شگفتگی اور ندرتِ احساس نے وقیع اہمیت کا حامل بنا دیا۔ 'یادوں کے سائے' ان کے تخلیقی سفر کے نشیب و فراز کی دلکش شعری داستان ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کے

Scanned with CamScanner

برسوں میں جب پرانی تہذیبی اور معاشرتی قدریں شکست وریخت کا شکار ہوئیں اور فرسودہ قرار دی گئیں تب اس وقت ممتاز کی غزلیں نہ صرف قدیم شعری روایت کی بازیافت بلکہ اس کی دلاویز تو سیع بھی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے عہد میں جب انسان کا انسلاک خارجی دنیا سے سے زیادہ بڑھنے لگا ہوتب ایک شاعرہ نے دل کی دنیا اور اس کی طلسماتی فضا کو شعر میں برت کر نسائی شخصیت کی تہذیب اور اپنی قابل تحسین فنکاری کا نمونہ پیش کر دیا۔

عشق تغزل کی بنیاد ہے جو ممتاز مرزا کی شاعری میں بھی اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایسا آفاقی جذبہ ہے جسے سرحدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کائنات کا وجود سلامت ہے یہ جذبہ بھی دلوں موج زن رہے گا۔ شاعرہ کی فن کاری یہ ہے کہ اس فرسودہ اور پامال موضوع کو انہوں نے اپنی شخصیت کی شائستگی، احساس کی تازہ کاری اور ہنر مندی سے ہم آمیز کر دیا۔ یہی تازگی اور اثر انگیزی ان کی غزلوں کا نمایاں وصف ہیں۔ ان کے یہاں جذبۂ عشق کی پر کیف نشاطیہ ترنگیں ہیں جو غزل کی فضا کو سوگواری اور یاس کے بجائے والہانہ سرور اور سرشاری بخشتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں:

وہ اک نگاہ کہ ہے چارہ گر بھی قاتل بھی
نہ جانے کتنوں کو جینا سکھا گئی ہوگی

●

سبوئے غم میں محبت کی چاشنی بھر دی
نگاہِ ناز مجھے پھر جلا دیا تو نے

●

تمہارے دم سے ہیں تنہائیاں بھی بزم حیات
تمہاری یادوں کا اک جمگھٹا سا رہتا ہے

●

پھیر لی جب نگاہ ساقی نے
لطف پھر ہم نے تشنگی کے لیے

Scanned with CamScanner

اک نظر نے زندگی کے سارے کانٹے چن لیے
گل بداماں کردیا ہے عشق خوش انجام نے

●

تیری یادوں کے دیے جب بھی جلاتا ہے یہ دل
حسن کچھ اور شبِ غم کا نکھر جاتا ہے

●

ہے کس کے دردِ فروزاں سے شمعِ دل روشن
ہے کس کی یاد سے مہکی ہوئی حیات تمام

محبت کا لافانی جذبہ اپنی وسعتوں میں زندگی، زمانہ اور تمام انسانی رابطوں کو سمیٹ لیتا ہے۔ یہ جذبہ آگ کی طرح دلوں میں روشن ہوتا ہے۔ یہی حیات و کائنات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ممتاز مرزا نے بھی اپنی غزلوں میں اسی وسعت اور بے کرانی کو کچھ اس طرح سمونے کی کوشش کی ہے کہ عشق کی حیات افزا جہت ان کے احساس وشعور کی علامت بن گئی ہے۔ کہیں کہیں اس کی فلسفیانہ شبیہہ جگنو کی مانند جھلملاتی نظر آتی ہے۔ مثلاً:

عشق کا بحرِ بے کراں پایا
تجھ کو پایا تو اک جہاں پایا

●

زندگی شورش، تلاطم، اضطراب
اور محبت زندگی کا ایک خواب

●

وہ اک نگاہ جو اتری تھی حرفِ کن کی طرح
ہمارے دل میں سمائی تو کائنات ہوئی

●

میں محبت ہوں حدوں میں نہ کرو قید مجھے
روشنی بن کے فضاؤں میں بکھر جانے دو

Scanned with CamScanner

غم ازل سے انسان کا مقدر ہے۔ یہی غم اردو شاعری کا محور بھی ہے۔ ممتاز مرزا کو بھی لذتِ غم عزیز ہے لیکن ان کے احساسِ غم میں ایک تحرک ہے، جس سے وہ خوشیاں اور مسرتیں کشید کر لیتی ہیں۔ اسی عمل اور تحرک سے روایت کی توسیع ہوتی ہے۔ عشقیہ شاعری میں یادیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جو ماضی اور حال کے درمیان ایک لطیف رشتہ بنائے رکھتی ہیں۔ ان میں والہانہ پن، سپردگی اور محبوب سے وابستگی کے جذبے نہاں رہتے ہیں۔ یہی ہجر کا پر کیف درد بھی دیتی ہیں اور فن کار کے لیے زندگی کا انمول خزانہ بھی ہوتی ہیں ۔ وقت کا بدلتا ہوا منظر نامہ ممتاز کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ ملال کے لمحوں کو مایوسی کی گرفت میں نہیں آنے دیتیں بلکہ اداسی کو نشاطیہ کیف میں بدلنے کا ہنر جانتی ہیں۔ چند مثال دیکھئے:

وہ کیف وہ سرور ملا ان کے درد میں
ممتاز عارضِ رخِ ہستی نکھر گئے

●

غمِ حیات کی خوشبو سے کچھ مہک اٹھی
یہ زندگی کہ ہے اک دشتِ آرزو کی طرح

●

مژدہ اے خارِ مغیلاں پھر جنوں کے فیض سے
بعد مدت کے ہوئے ہیں پاؤں صحرا آشنا

●

آرزو کے ماہ و انجم بجھ گئے تو کیا ہوا
پھر چراغِ خونِ دل سے یہ اندھیرے کم کریں

●

ساعتوں میں ہے لطف دنیا کا
اے غمِ ہجر تیری عمر دراز

●

Scanned with CamScanner

اپنے دل پر خود ہمیں رشک آئے ہے
درد میں بے مثل، غم میں انتخاب

●

ٹوٹی جو آس جل گئے پلکوں پہ سو چراغ
نکھرا کچھ اور رنگ شبِ انتظار کا

●

زندگی شامِ غم و صبحِ شبِ ہجر سہی
زندگی وصل کی اک رات بھی ہو سکتی ہے

کلاسیکی رنگِ سخن کی نمائندگی کے باوجود ممتاز کا محبوب ماورائی نہیں بلکہ جیتا جاگتا ایک انسانی وجود ہے۔ ہجر و وصال کے موضوعات اردو غزل کے لیے نئے نہیں مگر ممتاز کے یہاں اس کا انوکھا پہلو ملتا ہے۔ وہ روایتی عاشق کی طرح محبوب سے ملنے کو بے قرار نہیں۔ بلکہ ایسے مرحلوں میں عورت کے فطری ضبط و تحمل کا مظاہرہ ان کے اشعار میں نئے رنگ بھر دیتا ہے۔ بیشتر اشعار پر فراق کی رومانیت کا عکس نمایاں ہے۔ قربت کے لمحوں کی دلکش تصویریں پیش کرتے ہوئے شاعرہ کا مدھم اور نازک لہجہ ان کی فطری شخصیت کا غماز ہے۔ چند نمونے پیش ہیں:

ہمارے دل کے سبھی راز فاش کرتے ہیں
جھکی جھکی سی نظر، ہونٹ کپکپائے ہوئے

●

جو راز مدتوں سے مرے دل میں دفن تھا
کچھ لوگ تیری نیم نگاہی سے پا گئے

●

اس چشمِ نیم باز کی وہ کم نگاہیاں
دل میں اتر گئے مرے پیکاں نئے نئے

●

دل نے وہ رنج اٹھائے ہیں تغافل میں ترے
اب ترے لطف و عنایات سے جی ڈرتا ہے

Scanned with CamScanner

اک تبسم ، اک خفی ،اک اشارہ ،اک نظر
حرف وصدا سے بے نیاز ان کہی وہ کہانیاں

●

زباں کھلی نہ نگاہیں ملیں نہ بات ہوئی
عجیب رنگ میں شرحِ غمِ حیات ہوئی

●

وہی تجاہل ، وہی ادائیں ، وہی تغافل، وہی نگاہیں
وہ اب بھی ملتے ہیں ہم سے لیکن رکے رکے سے کھنچے کھنچے سے

●

ممتاز مرزا کی شاعری میں روشنی کے تلازمات توجہ طلب ہیں۔روشنی جو آگ کی صورت جسم وجاں کو حرارت بھی بخشتی ہے اور شعلوں سا بھڑک کر سب کچھ جلا کر خاک کر دینے کی قوت بھی رکھتی ہے۔روشنی جو چاند کی فسوں خیز چاندنی بھی ہے اور ستاروں کی طلسمی جھلملاہٹ بھی۔روشنی جو اگتے سورج کی نرم ونازک روپہلی کرن بھی ہے جس کو دیکھتے ہی رات کے اندھیرے ہاتھ ملتے بھاگ جاتے ہیں اور یہ دوپہر کی قہر آلود دھوپ بھی ہے۔یہ کڑکتی بجلیوں میں بھی ہے اور گھروں کو اجالا کرتے چراغوں میں بھی۔غرض ان کے اشعار میں روشنی اپنی مختلف صورتوں میں فروزاں ہے ۔نوری کرنوں سے جگمگاتے چند اشعار کا لطف لیں:

یہ کس کی یاد در آئی ہے چاندنی بن کے
یہ کس نے جھک کے پکارا ہے بام ماہ سے آج

●

تمہاری یاد کی خوشبو سے مہکی شامِ فراق
ستارے درد کے چمکے مہِ تمام کے ساتھ

●

تاریک ہیں راتیں مری تو نور سے بھر دے
اے ماہِ مبیں آج نہ جانے کے لیے آ

Scanned with CamScanner

●

جلنے لگے چراغ ترے غم کے شام سے
شام فراق آئی بڑے اہتمام سے

چلنے تو ہو مہ وپرویں کی سمت دیوانوں
طلسم کاہکشاں ہے ذرا سنبھل کے چلو

●

اک نیا خورشید ابھرے گا افق کے پار سے
ہاتھ ملتی رات کی سب ظلمتیں رہ جائیں گی

●

زمیں والو مناؤ خیر پھولوں کی، بہاروں کی
فضا میں ایک شعلہ سا لپکتے ہم نے دیکھا ہے

●

پھر جلے ہیں کچھ نشیمن، کچھ چراغ
منزلوں تک روشنی ہے دوستو

●

برق بے تاب ہے گرنے کے لیے
پھر نشیمن کوئی تعمیر کرو

●

ایسے اشعار ان کی شاعری کا حسن دوبالا کردیتے ہیں۔ ممتاز کی غزلوں کا آہنگ پرکشش اور اثر آفریں ہے، جیسے آواز کا ترنم لفظوں میں بھر گیا ہو۔ وہ دل فریب جذبوں کی نیرنگی سے خوب صورت پیکر تراش لیتی ہیں۔ شعری آہنگ میں محاوروں کا استعمال، کہیں کہیں ہندی الفاظ کی آمیزش اور سادہ مگر تہہ داری سے بھرپور اشعار من موہنے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

بے طرح آنکھ پھڑکتی ہے خدا خیر کرے
بے سبب آج طبیعت مری گھبراتی ہے

●

Scanned with CamScanner

پھر کوئی آئے عیادت کے لیے ممتاز جی
پھر نصیبِ دشمناں ہم آج کل بیمار ہیں

●

مجھے دیکھ کر رنگِ رخ کا وہ اڑنا
تنفس کے وہ زیر و بم یاد آئے

●

خدا غارت کرے دستِ ستم کو
ابھی تو آنکھ کھولی تھی کلی نے

●

صبا سے پوچھئے کیا گل کھلائے
چمن میں اس کی آہستہ روی نے

●

سانس روکے ہوئے فضا جیسے
رات یہ انتظار کی سی ہے

●

پھر پکارا ہے کسی نے مجھ کو
پھول کھلنے کی صدا ہو جیسے

●

ہجر کی کالی راتوں میں وہ پونم کا اک چاند لگے
درد کی پت جھڑ رت میں مہکے اک جانا پہچانا نام

●

ممتاز مرزا کا یہ مدھم اور مترنم لہجہ اور دھنک رنگ احساس جمال کا حسن ان کی غزلوں کو لائق تحسین بناتا ہے۔قدیم رنگِ سخن کی پیروی کے باوجود تصور کی توانائی، خیال کی لطافت اور لہجے کی غنائیت کے سبب ان کے اشعار قاری کو اپنے کیف و سرور سے مسحور کر لیتے ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

زاہدہ زیدی

۱۹۴۷ء کی آزادی خوش گوار خواب کی تعبیر کے بجائے ملک کی تقسیم کا عظیم سانحہ بن کر سامنے آئی۔اس ہولناک صورتِ حال نے نئے ادیب و فنکار کے ساتھ ساتھ مارکسی نظریات کے حامی شعراؔ وادباؔ کو بھی مایوسی، بے یقینی، اضطراب اور تشکیک کے احساسات سے بھر دیا۔خواب دیکھنا جب لاحاصل نکلا تو انسانیت، محبت اور یگانگت کے بجائے بے گانگی، بیزاری اور بے سروسامانی کے رجحان پرورش پانے لگے۔اقتدار کی ہوس کے سبب انسانی جذبوں کا استحصال، مکروفریب اور قتل و غارت گری کے دل دوز اور وحشت ناک منظر نامہ نے فن کار کے اندر فراریت کے جذبے کو ہوا دی۔اور یوں مارکس کی اشتراکیت پر سارتر کا وجودی نظریہ حاوی ہونے لگا۔نئی نسل پرانے تہذیبی اقدار کی شکست وریخت سے دل برداشتہ ہو کر نئے اور تازہ نظریات کے سائبان کو اپنی پناہ گاہ سمجھنے لگی۔تخلیق کار عصری ماحول سے فرار حاصل کر کے اسی چھاؤں میں بیٹھے اپنی ذات کے نہاں خانوں میں گم ہونے لگے۔زاہدہ زیدی اسی عہد کی ایک نام ور شاعرہ ہیں۔ان کی ولادت ۴؍جنوری ۱۹۳۰ء کو میرٹھ میں ہوئی۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور کیمبرج یونی ورسٹی، لندن سے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی میں ہی انگریزی زبان وادب کی پروفیسر رہیں۔

زاہدہ زیدی کی تخلیقی کائنات نظم ونثر کی مختلف اصناف پر محیط ہے۔نثر میں ڈراما، تنقید، ترجمہ نگاری اور شاعری میں غزل، نظم ان کی بصیرتِ فکر کے آفاق ہیں۔ان کے چار شعری مجموعے 'زہرِ حیات' 'دھرتی کا لمس' 'سنگِ جاں' اور 'شعلۂ جاں' شائع ہو چکے ہیں۔نثر میں بھی 'مسدود راہیں' جو مغربی ڈراموں کے ترجمے اور تنقید پر مشتمل ہے دوسری 'پانچ طبع زاد ڈرامے' کے نام سے 'رموزِ فکروفن' اور 'جدید مغربی ڈرامے کے اہم رجحانات' دو تنقیدی کتابیں اور ترجمے کے میدان میں

Scanned with CamScanner

'انسان اپنی تلاش میں' اور 'فلسفہ اور نفسیات' ان کی شہرت کا باعث رہے ہیں۔

زاہدہ کی شاعری کی ابتدا ۱۹۵۲ء میں ہوئی جب ترقی پسند تحریک ڈھلان کی جانب سفر آمادہ تھی۔ ان کی شاعری کے موضوعات وجودی فلسفہ پر مشتمل ہیں لیکن ان کی حساس فکر نے اپنی ذات کے ساتھ زمانے سے بھی ایک ذمہ دارانہ سروکار استوار رکھا۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ غزلیں کم ہیں مگر فکری آگہی اور باطن کے حسن کی تلاش میں ان کی نظریں ماضی کے عظیم تہذیبی ورثے کے منہدم ہوتے کھنڈر میں اخلاقی اقدار کے نقوش تلاش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جب مستقبل غیر یقینی، حال لہو رنگ اور ماضی غبار آلود ہو تو نئے امکانات کے افق دریافت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن تخلیقی نمو ایسی صورت میں بھی گل بوٹے کھلاتی رہتی ہے۔ ان کے چاروں شعری مجموعے اسی تخلیقی توانائی کا مظہر ہیں۔ اپنے عہد کی حسیت اور طویل شعری روایت کو خوب صورت توازن بخشنے میں ان کی فکری بصیرت اور جمالیاتی شعور کے ساتھ ان کی فنکارانہ ہنر مندی بھی شامل ہے۔ عصری حالات نے مایوسی، ناامیدی، لاحاصلی اور تنہائی کے احساس کو فروغ دیا جس کے سبب بے پناہی، فنا کا خوف اور یاسیت انسان کا مقدر بن گئی۔ لیکن زاہدہ کی شاعری میں دردوالم وجود کے اثبات کا مظہر ہیں:

یہ راہِ سخت یہ دشتِ الم کی پنہائی
قدم قدم پہ ہمیں ڈس رہی ہے تنہائی
امید و بیم کے صحرا میں یہ طویل سفر
تپش یہ سوزِ دروں کی یہ آبلہ پائی

●

ہے نا تمام ابھی داستانِ سوزِ دروں
کہ ایک عمر یہ داغِ نہاں سلگتے ہیں
گماں تھا نور کا جس پر وہ نار ہے شاید
شرر فشاں ہے نفس جسم و جاں سلگتے ہیں

Scanned with CamScanner

ایک زندانِ حوادث میں ہے پابستہ حیات
فکرِ آوارہ سے پوچھو کہ کدھر جائے گی

●

ہم نفس کوئی نہیں ہم قدم کوئی نہیں
گر مرا عکس بھی پڑتا تو پرایا ہوتا

●

یہ کس نگر میں آگئے یہ کون سا مقام ہے
سیاہیوں کی دوپہر تمازتوں کی شام ہے

●

یہ کس منزل پہ لے آئی تمنا
کہ بس اک دردِ تنہائی ہے محرم

●

دل و نگاہ کا زیاں سزائے جرم آگہی
مآلِ لذتِ خیال تلخئ دوام ہے

آزادی کے بعد آدرشوں کے خاک ہونے ،خوابوں کے ٹوٹنے اور آفاقی قدروں کی پامالی نے فن کار کی داخلیت اور دروں بینی کو توانائی بخشی۔ تقسیم ملک کا سانحہ صدیوں پرانی تہذیبی وراثت کی شکست کی صورت میں سامنے آیا۔ پھر فسادات کی بربریت نے رشتوں کی بے اعتباری اور بے زمینی کے احساس کو بڑھا دیا۔ زاہدہ نے اسی تجربے اور مشاہدے کی تہذیبی رچاؤ اور داخلی کرب کے ساتھ شعر کی صورت گری کی ہے۔ اپنے عہد کے پس منظر میں یہ اشعار گہری معنویت سے بھرپور ہیں:

صبا تو آئی مگر سوگوار آئی ہے
ڈبو کے خون میں آنچل بہار آئی ہے

●

Scanned with CamScanner

ہم خود ہی پیمبر ہیں ہمیں خود ہیں مسیحا
ٹوٹا ہے طلسم آج ہر اک راہ بری کا

●

سکوتِ شب ہجومِ ناامیدی
شمارِ داغ ہائے زیست اور ہم

●

شاید آئے سحر گئی ہے رات
زہرِ غم پی کے مر گئی ہے رات
یادیں اپنے لہو میں غلطاں ہیں
کتنا مجروح کر گئی ہے رات
ریزہ ریزہ ہیں جسم خوابوں کے
ٹکرے ٹکرے بکھر گئی ہے رات

●

دل میں ہے یوں جراحتوں کا ہجوم
جیسے ہاری ہوئی سپاہ کوئی

●

یہ اشعار اپنے عہد کا لہو میں ڈوبا منظر نامہ ہیں جہاں زہر غم پی کر رات مر رہی تھی اور شاعرہ کا دل ہاری ہوئی فوج کی مانند زخموں سے چور چور تھا۔ یہ اس طلسمی آئینہ کی ٹوٹی ہوئی کرچیاں ہیں جس میں مستقبل کے من چاہے خواب دل فریب رنگوں میں جھلملاتے تھے۔ اس بے بسی، کسمپرسی اور خوف سے پیدا شدہ بے یقینی بھی شاعرہ کا اہم موضوع ہے:

نہ راہ میں کوئی شجر نہ اب کوئی سراب ہے
نہ آرزو کے سلسلے، نہ ریگ زارِ خواب ہے

Scanned with CamScanner

نہ ابھرے گا سورج نہ چٹکیں گی کلیاں
بہت دور تک رات ہی رات ہوگی

●

دم بخود کوچہ و بازار میں دہشت کی صدا
رینگتی تنگ مکانوں میں گھٹن کی آواز

●

چار سو کوچہ و بازار میں محشر ہے بپا
خوف سے لوگ نکلتے نہیں اپنے گھر سے

●

سرخ مٹی کی ردا اوڑھے ہے نیلا آکاش
نہ شفق پھولے نہ رم جھم کہیں بادل برسے

انسانی زندگی کی ارزانی اور وقت کی سفاکی نے موت کی دہشت ناکی کو جنم دیا۔ جب سانسیں بے قیمت ہو جائیں، تہذیبی اور سماجی رابطوں کے خزانے روزِ روشن میں لٹ جائیں تو حیات کی بے معنویت کا احساس پنپنے لگتا ہے۔ ہم کیوں ہیں اور ہم کیا ہیں؟ جیسے سوالات دل و دماغ میں ناچنے لگتے ہیں۔ زاہدہ زیدی بھی ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو رمز کائنات میں کہیں پوشیدہ ہیں۔ اور یہیں سے ہستی اور نیستی کے فلسفیانہ افکار ان کی شاعری میں در آتے ہیں۔ کائنات میں مخفی زندگی کے اسرار و رموز کی آگہی ان کے اشعار کا رنگ بدل دیتی ہے:

گمان کاٹتے رہے حیات بانٹتے رہے
یہی تھا طرزِ زندگی کھلا ہوا حساب ہے

●

ہے موج موج میں پیچاں مری انا کا ثبات
کہ بحرِ غم نے اچھالا ہے بار بار مجھے

●

Scanned with CamScanner

خشک ویرانیوں میں کھو جائے نہ جوئے غمِ ذات
اس میں گھلنے دو ابھی گنگ و جمن کی آواز

●

جادۂ زیست میں نایاب متاعِ دوستی
ہم نے خود بڑھ کے اٹھالی ہے جہاں پائی ہے

●

یہ کیا عجب ہے کہ وہ بحرِ نیستی میں گری
نفس کی موج میں سستی بھی تھی روانی بھی

●

نمودِ زندگی کے راگ برگِ دل کی تال پر
لبوں پہ ہر مکینِ شب کے روشنی کا نام ہے

●

کچھ اور شانۂ ہستی ابھی سنوار مجھے
عروسِ مرگ سے ہونا ہے ہم کنار مجھے

●

برگِ دل کی تال پر نمودِ زندگی کے نغمے گانے کا حوصلہ زاہدہ کی شناخت ہے۔ عصری حسیت کی تلخیوں کے باوجود جدید شعرأ کی طرح ان کا لہجہ انفعالی نہیں بلکہ ماضی سے ذہنی اور جذباتی وابستگی انہیں تصورات اور افکار کے نئے افق کی تلاش میں مصروف رکھتی ہے۔ ان کے یہاں عصری رجحانات کے پہلو بہ پہلو ترقی پسند فلسفہ کی موجیں بھی رواں نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں وجود کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لانے کا عمل نمایاں ہے۔ جمود کے خلاف تحرک اور گم شدگی کے بجائے تلاش ان کی اہم تخلیقی جہات ہیں۔ اسی فکر اور جستجو سے حرارتِ زیست کی بے کرانی کا راز پانے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کے اسرار کو تہہ در تہہ کھول کر شعر میں آمیز کر دیتی ہیں:

سمجھے تھے جسے سانحہ شوریدہ سری کا
تھا نقطۂ آغاز وہی دیدہ وری کا

Scanned with CamScanner

یہ عالمِ صد رنگ بھی تکرار خودی ہے
کیوں ہم پہ پھر الزام ہے یہ خودنگری کا

●

شعور وفکر سے آگے ہے چشمۂ تخلیق
ہٹے گا سنگ تو بہنے لگے گا پانی بھی

●

ہم سے سیکھا ہے لبِ درد نے اندازِ کلام
ہم سے اک چشم تحیر نے زباں پائی ہے

فلسفیانہ فکر کے ساتھ ان کا باغیانہ اور ولولہ انگیز رویہ بھی ان کی شاعری کو حسن عطا کرتا ہے۔ جب وجود کی گہرائی اور توانائی کا سراغ مل جاتا ہے تو جذبہ وفکر کا بہاؤ نئے رخ اختیار کر لیتا ہے۔ پھر نئی فضا کی تشکیل کی خواہش یوں سر اٹھاتی ہے:

انداز جنوں، رسمِ وفا، مستیٔ احساس
سب خواب پرانے ہیں صنم اور تراشو

●

ہم نے طوفان سے پیمانِ وفا باندھا ہے
کہہ دو ہر موج تلاطم سے مقابل ہو جائے

●

ہوائے ادراک چل رہی ہے دریچے کھولو جراحتوں کے
تجلی فکر برق زن ہے جلاؤ مایوسیوں کے خرمن

●

جلا لو شمعیں، اٹھا لو ساغر کہو کہ مطرب رباب چھیڑیں
نہ کیوں ہوں تاریکیاں پشیماں حرارتِ زیست بے کراں ہے

شاعرہ کا فطری خلوص اور ان کی دردمند شخصیت عہدِ رفتہ کے گم شدہ منظروں کی یادوں

Scanned with CamScanner

میں جب ڈوب جاتی ہے تو شدتِ جذبات سے لب ریز ایسے اشعار جنم لیتے ہیں جن میں لطیف احساسات اک نئے منظر نامہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

سایہ ہو شجر کا تو کہیں بیٹھ کے دم لیں
منزل تو بہت دور ہے اور دھوپ کڑی ہے
وہ میری ہی گم گشتہ حقیقت تو نہیں تھی
رستے میں کئی روز سے شئے کوئی پڑی ہے

●

ہم کو کھینچے لیے جاتے ہیں یادوں کے بھنور
جانے کس وقت میں ہم لوگ چلے تھے گھر سے

●

نواحِ جاں کے ادھورے سفر کو یاد کریں
خیال و خواب کی اس رہ گزر کو یاد کریں
یہ خشک سال یہ بنجر زمیں یہ گرم ہوا
لہو کی موجِ رواں چشمِ تر کو یاد کریں

زاہدہ زیدی کا کمال یہ ہے کہ جدید فلسفیانہ خیالات کے باوجود انہوں نے تحریم غزل کا پاس رکھا کلاسیکی شعری روایت کے رچے ہوئے شعور اور اس کی تہذیب سے جذباتی وابستگی کے سبب موضوعِ عشق بھی ان کے لیے اچھوتا نہیں۔ اپنی عالم گیر صداقت کے اعتبار سے انسان کا یہ فطری جذبہ اپنے اندر لامتناہی وسعت رکھتا ہے۔ اس جذبے سے کسی انسان کو مفر نہیں کہ عشق وجۂ تخلیق کائنات ہے۔ شاعرہ نے بھی اسی بے کراں اور لامحدود عشق کو فلسفیانہ فکری تناظر عطا کر کے زندگی کی حسین علامت کے روپ میں پیش کیا ہے:

کبھی عالم غبارِ چشمِ حیراں
کبھی وہ اک نگہہ اور ایک عالم

●

Scanned with CamScanner

لکھو تو خونِ جگر سے ہوا کی لہروں پر
یہ داستان پرانی بھی ہے انوکھی بھی

●

کسی بیاضِ تمنا کے کچھ ورق پلٹیں
نگاہِ لطف کو رمزِ سفر کو یاد کریں
بدن کے لمس میں بجتی سی جل ترنگ سنیں
لہو کی بوند میں رقصِ شرر کو یاد کریں

●

یہ زخم کیسا لگا ہے تازہ کہ جس میں کرب ہے اور برکتیں بھی
کہ زخم جتنے تھے سب پرانے وہ لگ رہے ہیں بھلے بھلے سے

بہ حیثیتِ مجموعی زاہدہ زیدی کی غزلیں ان کے جمالیاتی تفکر، جذبات کی شدت اور قدیم وجدید شعری روایت و رجحان کا خوب صورت توازن پیش کرتی ہیں۔ پرانی علامتیں بھی تخلیقی تجربہ اور بلندئ فکر سے ہم آہنگ ہو کر خیال کے نئی تصویروں میں ڈھل جاتی ہیں۔ ان کے لہجے پر گو کہ کلاسیکی رنگ نمایاں ہے مگر محض تقلید کے طور پر نہیں بلکہ تہذیبی وراثت میں ان کی شرکت کا نتیجہ ہے۔ ان کی غزلیں قدیم رنگِ سخن کی کامیاب توسیع کہی جا سکتی ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

رشیدہ عیاںؔ

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب کلاسیکی شعری روایت کے رنگ و آہنگ میں بدلاؤ کی لہر چلی تو غزل بھی محض ادبی اور تہذیبی ورثہ نہیں رہ گئی بلکہ اس میں بھی نت نئی فکر اور بدلتے ہوئے معاشرتی اقدار کی صورت گری ہونے لگی۔ تبدیلی کا یہ رخ ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہی نظر آنے لگا۔ اس وقت ہم عصر شعراء نے نہ صرف اس کے خدوخال سنوارے بلکہ آب دار بھی کیا۔ بعد کی نسلوں نے اپنے جذبہ وفکر کی کھل کر ترجمانی کرتے ہوئے اس کی وقعت میں مزید اضافہ کیا جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسی قافلے میں شریک رشیدہ عیاںؔ ایک پروقار شخصیت کا نام ہے۔ ان کی پیدائش ۴ مارچ ۱۹۳۲ء کو مرادآباد ہوئی۔ لیکن اب امریکہ میں مقیم ہیں۔ صوفیانہ کلام پر مشتمل پہلا شعری مجموعہ 'حرف حرف آئینہ' کے نام سے جب کہ دوسرا 'کرن کرن اجالا' غزلوں کو اپنے دامن میں سمیٹے منظر عام پر آچکا ہے۔ تیسرا تازہ مجموعہ 'سوچ سمندر' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں نظمیں، غزلیں دونوں ہیں۔

رشیدہ عیاںؔ کی غزلوں کا افق حصارِ ذات کے ساتھ ساتھ زمانے کی وسعتوں پر محیط ہے۔ جذبہ حسن و عشق جو غزل کا بنیادی موضوع ہے، ان کے یہاں اپنی واقعیت، ارضیت اور مکمل تہذیب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ عشق کا فطری جذبہ دل سے شدت اور نظر سے احترام کا طالب ہوتا ہے۔ جس کی کسک اور تڑپ انسان کو سرنگوں کرنے کے بجائے سر بلند کرتی ہے۔ جذبۂ عشق انسانی زندگی کی لطافت، نزاکت اور نفاست کا نمائندہ ہوتا ہے۔ عیاںؔ نے بھی اس عالم گیر اور آفاقی جذبے کو اپنے خیال اور احساس کے دھنک رنگوں سے ہم آہنگ کر کے جمالیاتی بصیرت کی نقش گری کی ہے۔ مثلاً:

کائی لگی دیوار کی خوشبو، چاند، شفق
جب تم تھے تو سب کچھ اچھا تھا

Scanned with CamScanner

مرے وجود پر وہ بن کے اوس کیا برسا
زمیں سے آنے لگی مجھ کو آسماں کی مہک

●

وصل کی ٹھنڈی اوس کہیں اور کہیں ہے ہجر کی آگ
ان کی یادوں کی کیفیت دودھاری سی ہے

●

وحشت کی وہ دھوپ گئی چاہو تو کسی دن آجاؤ
میرے جنوں کے باغ میں اب تو ٹھنڈا ٹھنڈا سایہ ہے

●

موج میں آکے کبھی خود جو سنورنا چاہا
آبگینوں کو عیاںؔ آئینہ کرنا چاہا

●

اس ایک لمحے کو میں لازوال سمجھوں گی
ترے وصال کا موسم اگر کبھی دیکھا

عیاںؔ کی تخلیقی حسیت شعری تجربے کو وہ رنگ اور آہنگ عطا کرتی ہے جس سے شاعرہ کی داخلیت کی شناخت بھی ہوتی ہے اور جاں پر گزرنے والے دکھ درد کی بازیافت بھی۔ وہ صداقتیں بھی تجربے کا حصہ بن جاتی ہیں جو نسائی فطرت سے وابستہ ہیں۔ صنف نازک ہونے کا غرور، ضبط، نرمی، دردانگیزی کی کیفیات کو توازن اور شائستگی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر انہیں خوب معلوم ہے۔ جبریت، محکومیت اور منافقت کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے صنفی تحمل کے ساتھ ہی انہیں غزل کی حرمت کا پاس بھی رہتا ہے۔ شعری روایت کا پختہ شعور ان کے جذبوں کی تہذیب بھی کرتا ہے اور نسائی خودداری، قوتِ احساس اور استقامت کا مظہر بھی۔ نسائی فکر وخیال کے متنوع رنگ میں رنگی عیاںؔ کی غزلیں ان کی باطنی شخصیت کا حسین منظرنامہ بن گئی ہیں :

اتنی انا پہ بار تھی ہمدردیوں کی بھیک
اظہارِ حالِ دل بھی گوارہ نہیں کیا

Scanned with CamScanner

اہلِ پندار ہیں دریوزہ گری کب ہے قبول
بھیک لینے کو کسی در پہ تو جانے سے رہے
کھول ہی لیں گے فصیلوں میں نئے در ہم لوگ
لاکھ محبوس سہی وقت گنوانے سے رہے
کچھ عیاںؔ ہم بھی تو پندارِ وفا رکھتے ہیں
بے سبب روٹھنے والوں کو منانے سے رہے

●

ہم اپنے واسطے خود اپنی فصل بوئیں گے
کسی عطا سے جو پائے وہ سکھ فضول لگے

●

حصارِ ذات کے زنداں کو توڑنا چاہوں
گھٹن ہے اور نہیں صورت کوئی رہائی کی

نسائی وجود جسے صدیوں سے تہذیب کے نام پر زندانی بنا کر رکھا گیا ہے، اس جبر کے خلاف عیاںؔ کا اعلانیہ ان کی متحرک اور فعال فکر کا جمالیاتی اظہار ہے۔ جن ہاتھوں کا تصور کنگن، چوڑیوں، چھلوں اور حنائی گل بوٹوں کے ساتھ ہوتا تھا' اب وہ ہاتھ معاشرے کی چٹانی فصیلوں میں در کھولنے میں مصروف ہیں۔ ان کی غزلیں زندگی کے تعلق سے عمل اور ردِ عمل کے خوب صورت زاوئے پیش کرتی ہیں۔ احتجاج کے مدھم سروں میں تنبیہ کرتی ان کی آواز فکری تازہ کاری سے بھرپور ہے:

توڑو نہ یوں مجھے کہ عمارت ہی گر پڑے
اقدار کے ستون کی لازم کڑی ہوں میں
اپنے وجود میں ہوں میں سرچشمۂ حیات
گو مدتوں زمین میں زندہ گڑی ہوں میں

Scanned with CamScanner

میں حق کو حق کی طرح مانگنے کی قائل تھی
وہ تیرا در تھا جہاں رسم تھی گدائی کی

•

یہ کیوں کہوں کہ اسیری مرا مقدر ہے
وہی ہے قوتِ پرواز بال و پر میں ابھی

•

اس کی آنکھیں تھیں ہر اک روزنِ در سے نگراں
اپنی دانست میں بچ کر میں جدھر سے نکلی

•

ہماری صدیوں پرانی تہذیب کی زائیدہ اور پروردہ صنفی نابرابری پر عیاں کا یہ شعر ریاکار رویوں کے خلاف کڑی لیکن خوب صورت تنبیہ ہے۔ کیوں کہ سماج اور معاشرے کا توازن برقرار رکھنے کے لیے نسائی وجود کی قوت کا اثبات لازمی ہے۔ شاعرہ وقت کے بپھرے ہوئے سمندر میں ابلتی موجوں سے تحرک پاتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام رنگ ہیں جو نہ صرف عصری زندگی کی پہچان ہیں بلکہ عہدِ حاضر کا المیہ بھی ہیں۔ ایک باشعور فرد کی مانند ان کی نظریں وقت کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتی ہیں۔ اقدار کی شکست و ریخت کے دور میں عیاں بڑے وقار، عزم اور حوصلے کے ساتھ اپنے داخلی تحرک کی کشتی کا بادبان سلامت رکھتی ہیں۔ یہی تحرک انہیں سرگرم سفر رکھتا ہے۔ ناہمواریوں اور دشواریوں کے درمیان نئی راہیں بھی نکالتا ہے اور آیندگاں کے لیے حوصلے اور تازگی کی سرسبز فصلیں چھوڑ جاتا ہے:

وہ راہ رو ہوں جو کرتے ہیں منزلیں تشکیل
میں وہ نہیں کہ جسے قافلے کی دھول ملے

•

لگاؤ سنگِ صدا شیشہء سکوت پہ آج
زمانے والو پکارو کہ سو گئے ہم بھی

Scanned with CamScanner

صفیں بنائی تو ہیں یہ بھی دیکھنا ہوگا
کوئی غنیم نہ شامل مری سپاہ میں ہو

●

سلگ رہے ہیں پر ہمیں تو احتیاج شعلہ ہے
ہوٗ بے حسی کی برف تو حرارتیں بھی چاہئے

●

سر پہ اٹھا کے بارِ مصائب چلیں عیاںؔ
دیکھیں ہمارے چاہنے والے کدھر گئے

●

سب لگے سر پر اپنے سو پشتوں کے آلام
سینے کے اندر مٹھی بھر شے بھاری سی ہے

●

یہی مٹھی بھر بھاری شئے عیاںؔ کی جرأتِ فکر کو پرواز عطا کرتی ہے۔ اجتماعی دکھ درد میں ان کی شراکت داری اپنے عہد کے اخلاقی زوال، جذباتی محرومی، نا آسودگی، گھٹن، بے اطمینانی اور بے یقینی کے خلاف انہیں سر گرم عمل رکھتی ہے۔ عیاںؔ کی شاعری کا کینوس وسیع اور روشن امکانات سے بھرا ہوا ہے۔ جو نسائی اردو غزل کے لئے خوش آئند ہے۔ ان کے یہاں پتھر میں شگاف ڈالنے کا عمل بہ اندازِ وحشت و جنون نہیں بلکہ ہوش و حواس کی سلامتی اور جگمگاتی فکر کے ساتھ ہے۔ کہیں کہیں کٹیلا لیکن تھما تھما نرم لہجہ اپنی پر کیف نزاکت کے سبب دل میں اتر جاتا ہے:

شعر کہاں یہ دل کے دروازے پر ہلکی دستک ہے
ایک کنی الماس کی جس سے پتھر میں در کھولوں ہوں

●

گھر کے سارے شیشے آخر کس نے چکنا چور کئے
مجھ کو اپنی جان سے پیارے اپنے سب ہمسائے تھے

Scanned with CamScanner

•

دیر سے مجھ پہ ہیں جو سنگ زنی میں مصروف
دیکھتی ہوں تو سبھی ہاتھ مرے اپنے ہیں

عیاںؔ کی شاعری الماس کی کنی سے پتھر میں در کھولنے کی خوب صورت کاوش ہے۔ وہ زندگی کے محاذ پر ایک مجاہد کی طرح شاطر معاشرے سے نبرد آزما ہیں اور انہیں اس بات کی خوب خبر ہے کہ سسٹم میں جلدی بدلاؤ آنے والا نہیں اس لیے کہتی ہیں:

ابھی بے وقت ہیں منزل کی باتیں
ابھی کچھ اور رہنا ہے سفر میں

•

کم اجر توں لوگ رضامند ہو گئے
کیسا شکم کی آگ نے لاچار کر دیا

•

حصارِ ذات سے باہر نکل کے دیکھا جب
تو اپنے غم سے فزوں دوسروں کے غم نکلے

•

یہ موجِ درد نے لا کر کہاں اچھالا ہے
کہ ڈوبتوں کا مرے ارد گرد ہالا ہے

•

ترکِ سفر بے سود ہے ساتھی تھوڑا سا دن باقی ہے
دھوپ سے جلتے صحرا شاید شام پڑے ٹھنڈے ہو جائیں

•

عیاںؔ میں بیٹی ہوں ایسے قبیلے والوں کی
کہ جس نے ظلم کے آگے نہ سر اٹھائے کبھی

Scanned with CamScanner

●

وہی ہے دھار وہی کاٹ اور وہی تلوار
یہ اور بات کہ صورت نئی ہے قاتل کی

عیاں نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو غزلوں میں سمو کر اپنی فکری بالیدگی اور عصری آگہی کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے اردو غزل کی طویل اور سنہری شعری روایت کی روشنی میں نہ صرف اپنا سفر طئے کیا ہے بلکہ اپنی نسائی ذات کے حوالے سے نمایاں شناخت بھی بنائی ہے۔ زبان کا تخلیقی استعمال خوش گوار اثر چھوڑتا ہے۔ منفرد شعری حسیت کے سبب ان کے اشعار میں پیکر تراشی کا نازک عمل فطرت کے مظاہر کے ساتھ ساتھ روز مرہ زندگی کی اشیا کے حوالے سے وجود میں آیا ہے:

گرم توے پر جیسے کوئی بوند گرے
یوں وہ آتا ہے رخصت ہو جاتا ہے

●

ننھے منے ہاتھوں میں جب بھیک کا کاسہ دیکھوں ہوں
دیر تلک میں ہاتھ سمیٹے خالی جیب ٹٹولوں ہوں

●

بے امن رت ہے پیڑوں کے ڈھلکے ہوئے ہیں ہاتھ
حرفِ دعا بھی پتوں کے لب پر نہیں کوئی

●

اٹھ اٹھ کے بار بار کسے ڈھونڈتی ہے لہر
شاید بچھڑ گیا ہے سمندر سے بھی کوئی

●

ہستی کے گنجان شجر سے چپکے سے
سال کا پتا گرتا ہے کھو جاتا ہے

Scanned with CamScanner

ساحل کے شانے ہیں بھیگے بھیگے سے
ان پہ سمندر سر رکھ کر رویا ہوگا

●

رات دل کیا کیا حدیثِ آرزو کہتا رہا
چاند پتے کی طرح تالاب میں بہتا رہا

●

بند دریچے ذات کے پل پل کھول رہے ہیں
کانوں میں احساس کے جھینگر بول رہے ہیں

●

ان مثالوں سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رشیدہ عیاںؔ کی غزلیں جذبوں کے کیف اور فکری شعور کا دلکش امتزاج ہیں۔ نئی اردو غزل کے اوراق پر ان کا نام اپنی جگمگاہٹ کے ساتھ نمایاں مقام کا حامل ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

سیدہ فرحت

سیدہ فرحت کی ولادت بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے نصف اول میں بھوپال میں ہوئی۔ان کے والد سید علی مہدی بھوپال میں سب انسپکٹر پولس تھے اور والدہ سیادت فاطمہ صوم و صلوۃ کی پابند گھریلو خاتون تھیں۔ان کا گھرانا پرانی تہذیبی قدروں کا امین تھا۔اس لیے ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے عصری ماحول کے مطابق پھوپھا سید اصغر حسین کی نگرانی میں گھر پر ہی ہوتی رہی۔ ماموں ڈاکٹر عابد حسین کے مشورہ پر برقع پوش بارہ سالہ سیدہ فرحت کا نام حمیدیہ گرلز اسکول میں لکھوایا گیا۔ جب وہ سلطانیہ گرلز اسکول میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں تو ان کے والد کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا جس کے سبب باقاعدہ ان کی تعلیم جاری نہیں رہ پائی۔ باوجود اس کے گھریلو علمی اور ادبی ماحول نے ان کے شعور اور تخلیقی صلاحیت کی آبیاری کی۔ شعر گوئی کی ابتدا بارہ سال کی عمر میں ہی ہو چکی تھی۔ جس کو مزید جلا بھوپال کے مضافات کی حسین فضا اور خوش رنگ مناظر فطرت سے ملی۔ ماموں عابد حسین اور ممانی صالحہ عابد حسین کی حوصلہ افزائی نے بھی سیدہ فرحت کو اعتماد اور تحرک بخشا۔ابتدا میں استاذ جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے اصلاح اور مشورے سے نوازا اور پہلے مجموعہ 'بزمِ خیال' پر ایک تعارفی اور تاثراتی مضمون بھی لکھا۔ان کی ادبی اور علمی گھریلو فضا نے ان کے ذوق و شوق کو اس طرح نکھارا اور سنوارا کہ دو شعری مجموعے 'بزمِ خیال' اور 'نوائے حیات' اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ منظرِ عام پر آ کر مقبول ہوئے۔اس کے علاوہ بچوں کے لیے کہی گئی نظموں پر مشتمل ایک کتاب 'بچوں کی مسکان' کے نام سے بھی شائع ہو کر ادبِ اطفال کے گراں قدر سرمائے میں اضافہ کا سبب بنی۔

ڈاکٹر عابد حسین اور صالحہ عابد حسین کے ساتھ سیدہ فرحت کئی سال دہلی میں مقیم بھی رہیں۔دورانِ قیام جامعہ ملیہ میں قائم ترقی پسند مصنفین کے انجمن کی ممبر بھی بنیں اور اس کی

Scanned with CamScanner

نشستوں میں اپنی تخلیقات بھی پیش کرتی رہیں۔انہیں محفلوں میں انہیں غلام ربانی تاباں ،سردار جعفری،اور کیفی اعظمی کے ساتھ ساتھ دوسرے معتبر شاعروں اور ادیبوں کو دیکھنے، سننے اور ان سے فیضیاب ہونے کا موقع بھی ملا۔۱۹۵۵ء میں ان کی شادی جامعہ ملیہ کے ادارہ تعلیم وترقی سے منسلک قیصر نقوی سے ہوئی۔شوہر کے سرگرم سماجی کارکن ہونے کے سبب سیدہ فرحت بھی انکی رفاقت میں سماج اور معاشرہ کی خدمت میں جٹ گئیں۔ساتھ ہی ان کی تخلیقات بھی ہم عصر رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔بچوں کے ترانے اور قوالیوں کے ساتھ ساتھ نسائی اور معاشرتی مسائل بھی ان کی نظموں میں راہ پاتے رہے اور اس کے پہلو بہ پہلو غزلیں بھی اپنے تیور دکھاتی رہیں۔یوں خانگی ذمہ داریوں اور سماجی مصروفیات کے درمیان شعر وادب بھی نمو پاکر پروان چڑھتے رہے۔

علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی کے مشورے پر ۱۹۵۷ء میں قیصر نقوی اور سیدہ فرحت مستقل علی گڑھ آبسے۔یہاں آنے کے بعد وہ آل انڈیا فیڈریشن، علی گڑھ کی صدر بنیں اور تعلیمِ بالغاں مشن کو فروغ دینے میں مصروف ہوگئیں۔انہوں نے اپنے گھر پر لگ بھگ دس ،گیارہ برسوں تک نجی طور پر ایک اسکول بھی چلایا۔گویا سیدہ فرحت کی زندگی سماج اور علم وادب کی بےلوث خدمت سے عبارت رہی۔

سیدہ فرحت کی غزلیں کلاسیکی اور ہم عصر رجحانات کے ساتھ ہی ان کی فکری بالیدگی کی آئینہ دار ہیں۔ان کے یہاں قدیم شعری روایت کا احترام بھی ہے اور وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر نئے افکار کی شمولیت بھی۔ان کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات بڑے اعتدال اور توازن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔غزل گو کہ عشقیہ مضامین کی پیش کش کے لیے مشہور رہی ہے لیکن ترقی پسند شعراء نے اسے نئے رنگ اور نئے تیور سے آشنا کرایا۔فرحت کی غزلوں میں بھی اس تبدیلی کے نقوش عیاں ہیں۔عمل اور تحرک،انسانی ہمدردی کا جذبہ،اخلاقی قدروں کے زوال اور عوام کے استحصال کا دکھ ان کے اشعار میں نمایاں ہے۔

انسان جہاں بھی پاتے ہیں ہم دل سے اسے اپناتے ہیں
یہ مذہب وملت کے جھگڑے ہم اہل محبت کیا جانیں

●

Scanned with CamScanner

علم و دانش کی کتابوں میں نہیں رمزِ حیات
چلتے پھرتے ہوئے انساں ہیں نشانی کے لیے

●

ہر چہرہ اک کتاب کی صورت پڑھا کرو
انسانیت کے درد سے دل آشنا کرو

●

تقریر کی لذت خوب سہی پر مردِ مجاہد ہے تو وہی
جو ٹکر لے طوفانوں سے جو کود پڑے انگاروں میں

●

انسان کا غم جو اپنائیں جو نقشِ حقیقت چمکائیں
فن کار گنے جائیں گے وہی مستقبل کے معماروں میں

●

رہیں روشن ہمیشہ فکرِ انسانی کی قندیلیں
مگر آلودہ ظلمت رہیں انساں کی تقدیریں

●

ہے ظلم وستم کا راج وہی ہے جبر و تشدد آج وہی
کم زور کو حق جینے کا نہیں طاقت کی حکومت آج بھی ہے
جو توڑ دے سب دیواروں کو جو پھول کرے انگاروں کو
انسان کو ایسے مذہب کی درکار ہدایت آج بھی ہے

●

لہو عوام کا ، غازہ رخِ سیاست کا
بھرم اسی سے حکومت کے سربراہوں کا
یہ منعموں میں ہے شاہانہ تمکنت کیسی
سنا ہے دور گیا اب تو بادشاہوں کا

Scanned with CamScanner

فکرِ تعمیرِ نشیمن میں ہے بلبل پھر بھی
دامِ صیاد بھی ہے برقِ شرر بار بھی ہے
منحصر حوصلۂ دل پہ ہے ثابت قدمی
جادۂ شوق یہاں سہل بھی دشوار بھی ہے

●

ان ہی خوابوں سے تو ہوتی ہے تلاشِ تعبیر
ختم یہ سلسلۂ خواب نہ ہونے پائے

●

سیدہ فرحت کی فطری حوصلہ مندی ان اشعار میں نمایاں ہے۔ زندگی کے مثبت پہلوؤں پر نگاہ مرتکز رکھنے اور سر اٹھا کر پورے عزم اور ولولے کے ساتھ جینے کی آرزومندی شاعرہ کے یہاں بھر پور توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے اشعار میں جا بجا ان کے شاعرانہ نظریہ کا عکس ملتا ہے۔ مثلاً:

ہم اہلِ عشق جلائیں اگر نہ دل کے چراغ
کہیں جہاں میں محبت کی روشنی نہ رہے

●

اپنے زخموں کو بھی سہلاؤ مگر دھیان رہے
تم سے بھی کچھ ہیں سوا درد کے مارے کتنے

یہی وسیع المشربی سیدہ فرحت کی دردمند شخصیت، جمالیاتی جذبہ واحساس اور تخلیقی توانائی کی شناخت ہے۔ وہ اپنے ماحول اور معاشرے کے لوگوں کے درد کو اپنی ذات کا اس طرح حصہ بنا لیتی ہیں کہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ پلکیں کس کارن نم ناک ہیں۔ زندگی دکھ سکھ کا مجموعہ ہے۔ سکھ کے لمحے آتے ہیں گزر جاتے ہیں لیکن درد کا موسم مستقل دل میں خیمہ زن ہوتا ہے۔ یہی چبھتے ٹیس دیتے غم شعر وادب کے بنیاد گزار ہوتے ہیں۔ کبھی یادوں کی صورت مجسم تو کبھی خوابوں میں پرچھائیوں کی طرح کانپتے ڈولتے پھرتے ہیں۔ ان تجربوں سے تمام عمر نباہنا بھی ایک ہنر ہے اور

Scanned with CamScanner

اسے زندگی کا سرمایہ بنالینا حوصلے کی بات۔ دکھ درد انگیز کرنے کا یہی سلیقہ اور حوصلہ فن کار کے جمالیاتی وجدان کو مظاہرِ کائنات سے حسن کی کشید کا شعور بھی بخشتا ہے۔ خیال وفکر کی بے انت وسعتیں بھی اسی جذبے کی دین ہیں۔ عرفانِ ذات و کائنات کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت اور پرسکون مستقبل کی تشکیل میں بھی یہی احساس کارفرما ہوتا ہے گویا یہ احساس نہ ہوتو انسان مثلِ حیوان ہے۔ سیدہ فرحت درد کی قندیلوں سے زندگی میں روشنی اور جگمگاہٹ بھرتی ہیں۔

خدا کرے تجھے احساسِ درد وغم نہ رہے
دعائے خیر وہ دیتے ہیں بد عا کی طرح

●

غمِ دوراں کو غمِ دل کا مداوا سمجھا
اس خرابے میں بسارکھی ہے دنیا ہم نے

●

کسی تازہ غم کی ہے پھر آمد آمد
مرا مسکرانے کو جی چاہتا ہے

●

دیدہ ءتر سے تپش اور فزوں ہوتی ہے
دل ہو کچھ اور لہو سوزِ نہانی کے لیے

●

ہو کے خاموش نہ بے کار ہو یہ سازِ وجود
نغمہء درد کی لے اور بڑھائے رکھیے

سیدہ فرحت کے تخیل کی اڑانیں کائنات اور ماورائے کائنات بھی ہیں۔ انہیں حسنِ کائنات کے ساتھ ساتھ حسنِ ازلی کا بھی خوب علم ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی فکر ذات کے حصار سے باہر ان دیکھے جہانوں کا سفر چاہتی ہے۔ طلسمِ زندگی انہیں جمالیاتی تحیر عطا کرتا ہے۔ اسی تحیر

Scanned with CamScanner

میں پوشیدہ ہے وہ تجسس جو روح کو مرکزِ اصلی کی تلاش میں سرگرم رکھتا ہے۔ اس لیے ان کے اشعار میں فلسفیانہ فکر کی لہریں بھی موج زن ملتی ہیں:

وہ روح بن کے مری فکر اور شعور میں ہے
وہ ایک درد ہے جو قلبِ ناصبور میں ہے
یہ کائنات ہے حسنِ ازل کا عکسِ جمیل
افق کے رنگ میں ہے وہ سحر کے نور میں ہے

●

طلسمِ زندگی کیا ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جدھر اٹھے نظر حیرانیاں معلوم ہوتی ہیں

●

فنا ذوقِ خود آگاہی میں ہونا
اسی کا نام عمرِ جاوداں ہے

●

ہم کو تلاش جادۂ ملکِ بقا کی ہے
وہ راہ جس میں پہلی ہی منزل فنا کی ہے

●

کہاں ہے تو یہ پتا دے حقیقتِ ازلی
ہمیں تو دیر و حرم میں ترا نشاں نہ ملا

●

کیا بتائیں تمھیں ہم منزلِ عرفاں کیا ہے
صرف اک عالمِ حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں
مضطرب روح کو ہے مرکزِ اصلی کی تلاش
زندگی اک غمِ فرقت کے سوا کچھ بھی نہیں

Scanned with CamScanner

تلاشِ ذات کی منزل سے جب گزر جاؤ
نظر بلند کرو سیرِ کائنات کرو

●

نہ فرشِ خاک پہ ٹھہریں گے نقشِ پا کی طرح
رواں دواں ہیں فضاؤں میں ہم ہوا کی طرح

سیدہ فرحت کے جذبہ واحساس کا تحرک انہیں کسی مقام پر نکلنے نہیں دیتا کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ زندگی مسلسل سفر سے عبارت ہے۔ سفر جو ذات سے کائنات اور ماورائے کائنات پر مشتمل ہے۔ فنا ہونے کا احساس شاعرہ کے نزدیک عمر جاودانی حاصل ہونا ہے۔ خالق سے محبت اس کی مخلوق کی محبت میں نہاں ہے۔ اس دنیا میں انسان پیامبر ہے اس خالقِ حقیقی کا جس کا حسن ذرہ ذرہ میں عیاں ہے۔ سیدہ فرحت کی شاعری میں زندگی کا یہ رمز بے حد دل نشیں انداز میں پیش ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا محور محبت ہے جو اپنے وسیع تر آفاق میں تازہ ہواؤں کی صورت رواں دواں ہے۔ ان کی غزلیں محبت کے آفاقی جمالیاتی شعور اور تخلیقی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

جمیلہ بانو

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو شاعری کی دنیا میں شاعرات کی قابل لحاظ تعداد سامنے آئی۔ کچھ نے اپنے سخن کا رشتہ نئی فکر اور نئے شعری مزاج سے مربوط کیا تو دوسری طرف ایسی شاعرات بھی رہیں جنہوں نے کلاسیکی طرزِ بیان کی تقلید کو اپنا تہذیبی ورثہ جانا۔ جمیلہ بانو بھی اسی کلاسیکی اندازِ سخن کی شاعرہ ہیں۔ ان کی ولادت ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ انہوں نے میٹرک علی گڑھ سے، پری یونی ورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی سے اور بی اے ذاکر حسین کالج دہلی سے کیا۔ ان کے والد سید شبیر حسن قتیل لکھنوء کے مشہور شاعر تھے، جن کا سلسلۂ نسب نوابین اودھ سے ملتا ہے۔ اس لیے جمیلہ کی شاعری میں بھی وہی رکھ رکھاو موجود ہے جو لکھنوء کی اہم شناخت رہی ہے۔ ان کا اولین شعری مجموعہ 'حرفِ آرزو' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا جو ان کی تہذیبی اور ادبی روایت کا نمائندہ ہے۔

'حرفِ آرزو' کی شاعری دل اور اس کی وسیع دنیا کی حکایت ہے۔ رنگا رنگ تصورات، نازک اور لطیف جذبوں کے سہارے جمیلہ عشق کے روایتی موضوع کو شگفتگی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ یوں بھی قصہء جاں کی لذت اور اثر انگیزی ہر عہد میں اپنا الگ ہی کیف رکھتی ہے۔ شاعرہ نے بھی اس آفاقی صداقت کو اپنے خیال کی تازہ کاری، لہجے کی روانی اور بے ساختگی کے سہارے کچھ نیا پن دینے کی کوشش کی ہے۔ خواب، یاد اور آرزومندی کے احساسات کی کچھ تصویریں ان اشعار میں یوں قید ہوئی ہیں:

وہ صبح آئے کہ پھر جس کی کوئی شام نہ ہو
جو میرا خواب ترے خواب سے بدل جائے

Scanned with CamScanner

نام تیرا جو کوئی لے کے مخاطب کرتا
میں سمجھتی کہ مری خود سے شناسائی ہے

●

تم ہو اک خواب تو اس خواب کی تعبیر ہوں میں
میں اگر روٹھ بھی جاؤں تو منا لو مجھ کو

●

یاد آتا ہے تمہارا ہر اک انداز مجھے
جب سے بچھڑے ہو دیے جاتے ہو آواز مجھے

●

خیال تھا کہ ہزاروں شکایتیں ہوں گی
وہ سامنے ہیں تو کہنے کی بات کچھ بھی نہیں

ان اشعار میں جذبہ و احساس کی تازگی اور شعریت ہے۔ جذبے کی شدت کہیں کہیں جب فطرت سے ہم آہنگ ہو کر شعر میں ڈھلتی ہے تو من موہنے اور پر کیف منظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جمیلہ بانو کی تخلیقی شخصیت اور جمالیاتی مزاج کا خوب صورت اظہار کچھ اشعار میں یوں جھلک مارتا نظر آتا ہے:

بہارِ گل چمن پر مہرباں ہے
ہوا کے دوش پر عمر رواں ہے

●

نظر نظر مہ و انجم، نفس نفس خوشبو
ترے خیال کی بستی عجیب بستی ہے

●

شاخِ گل پر جو ٹھہر جاتی ہے شبنم دمِ صبح
کتنی بھیگی ہوئی پلکوں کا پتا دیتی ہے

●

بدلتے وقت کے ساتھ جب شعروادب میں نئی روش، نئی رہ گزر اور نئے چلن رواج پانے لگے تو کلاسیکی رنگِ سخن بھی نئے تقاضوں سے آمیز ہونے لگا۔ ایسے ماحول میں شاعرات کے یہاں بھی یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ کچھ کے یہاں موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی تبدیلیاں ہوئیں اور کچھ نے نئے خیال تو قبول کئے مگر لہجے روایتی ہی رکھا۔ جمیلؔہ بانو بھی اسی روایتی لہجے کی امین ہیں۔ عصری تقاضوں کے سبب ان کے اشعار میں خیال وفکر کی جدت تو ملتی ہے لیکن لہجہ میں نیا رنگ نہیں گھول پاتیں۔ پھر بھی شاعرانہ نفاست اور تہذیبِ ادا قابلِ تحسین ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

چلیں تو دل کو سنبھالے ہوئے چلیں ہم تم
یہ شہر شیشہ نہیں پتھروں کی بستی ہے

●

نہ جانے کون سا لمحہ مری تلاش میں ہے
جمیلؔہ دل بھی بہت چپ ہے اب زباں کی طرح

●

پھر گنبدِ عالم میں گونجے گی صدا میری
اس مہر خموشی کو گر توڑ دیا جائے

●

بہت قریب سے دیکھا ہے زندگی تجھ کو
ہزار رنگ بدلتی ہے آسماں کی طرح

●

ہر طرف جام سے چھلکتے ہیں
روح انسان پھر بھی پیاسی ہے

●

ٹوٹ جاتے تھے جہاں چاند ستاروں کے بھرم
ہم نے گرتے ہوئے دیکھا ہے ان ایوانوں کو

Scanned with CamScanner

میری تنہائی کے صحرا سے نکالو مجھ کو
وقت کی تیز ہواؤں سے بچالو مجھ کو
آئینہ میرے تعاقب میں ہے، میں خائف ہوں
تم کسی اور نئی شکل میں ڈھالو مجھ کو

●

بہت گھٹن ہے کہیں دم نہ گھٹ کے رہ جائے
کوئی تو بولو خدارا کوئی تو بات کرو

بہر کیف گھٹن کی خاموش فضاؤں میں بولنے اور بات کرنے کے لیے بے قرار شاعرہ کے جذبہ وفکر اس بات کا اشاریہ ہیں کہ وہ نہ صرف بہ حیثیت عورت بلکہ ایک زندہ انسان کے طور پر بھی مکالمہ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے پیش نظر چوں کہ صدیوں کی زریں اردو شعری روایت رہی ہے اس لیے ان غزلیں بھی اسی تہذیبی اور فنی روایت کا جمالیاتی اظہار ہیں۔ یہی شائستگی، تہذیب اور فطری حجاب جمیلہ بانو کی غزلوں کو وقار بخشتے ہیں۔

●●

صغریٰ عالم

صغریٰ بیگم ۱۸/ جنوری ۱۹۳۸ء میں صوبہ کرناٹک کے مشہور شہر گلبرگہ میں پیدا ہوئیں۔عالم خاندان میں شادی ہونے کے سبب شعروادب کی دنیا میں وہ صغریٰ عالم کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ان کی تقریباً گیارہ کتابیں منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکی ہیں۔جن میں ان کا تحقیقی مقالہ 'عنوان چشتی۔محقق ،ناقد اور شاعر' کے ساتھ 'کفِ میزان' ان کے ذریعہ کیے گئے تبصروں پر مشتمل ہے۔اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صغریٰ کو نثر و نظم دونوں پر ہی دسترس حاصل تھا۔ان کے سات شعری مجموعے اشاعت کے مرحلوں سے گزر کر ان کی شاعرانہ شخصیت کی شناخت بن چکے ہیں۔پہلا 'حیطۂ صدف' ۱۹۹۰ء میں دوسرا 'بیت الحروف' ۱۹۹۵ء میں تیسرا 'صفِ ریحاں' ۱۹۹۷ء میں چوتھا 'محرابِ دعا' جو حمد و نعت پر مشتمل ہے ۱۹۹۹ء میں پانچواں 'قوسِ وقزح' ۲۰۰۴ء میں چھٹا 'حنا غزل' ۲۰۰۵ء اور ساتواں 'نشاطِ معنیٰ' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئے۔

بیسویں صدی کا نصفِ اول گزرتے گزرتے عورتیں بھی زیادہ تعداد میں مردوں کے دوش بدوش باہری زندگی کی سرگرمیوں میں الجھ چکی تھیں۔زندگی کے دیگر شعبوں میں نمائندگی درج کرانے کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کے بھی مختلف شعبوں میں بھی ان کی سرگرمیاں رنگ دکھانے لگیں۔زندگی سے نبرد آزمائی کا تجربہ الگ الگ روپ میں شعروادب کا حصہ بننے لگا۔جس میں ذات کے ساتھ زمانہ کی نیرنگیاں بھی موضوع شعروادب بنتی گئیں۔خبروں کے ذریعہ ساری دنیا کے واقعات وحادثات کا علم فن کار کی وسعتِ فکر میں اضافہ کا سبب بنا۔اور دوسروں کے دکھ میں شرکت کرنا ہر حساس اور دردمند فنکار کی ذمہ داری ٹھہری۔صغریٰ عالم نے بھی ایک حساس اور دردمند شاعرہ کی طرح ماحول میں بکھرے کرب کو زبان دینے میں مصروف نظر آتی ہیں:

Scanned with CamScanner

شہروں کی زمیں سرخ تھی لاشوں سے ڈھکی تھی
گل ریز ہری بیل فصیلوں پہ چڑھی تھی

●

حدِ نظر سے آگے اک شعلگی کا موسم
خواب و گماں شکستہ ہر اک خیال زخمی

●

فلک نے سیکھا ہے حالات کو زبوں کرنا
ہر ایک گھر کو کسی طرح بے ستوں کرنا

●

انہیں بھی جنگ نے مارا نکل آئے تھے سڑکوں پر
کئی معصوم بچے چٹکیوں میں تتلیاں بھر کر

●

چیخیں بھی دربدر ہوئیں ایسی کہ بار ہا
خاموش راستوں کے وہ پتھر بھی ڈر گئے
ملبہ تھا کرچیاں تھیں جلے ادھ جلے مکاں
ایسی گلی میں ہم بھی بہت بے خبر گئے

●

شب کے لمحات ہیں پگھلے ہوئے اولوں کی طرح
ساعتیں دن کی ہیں بارود کے گولوں کی طرح

ان اشعار سے قطع نظر صغریٰ عالم کی غزلوں کا رنگ خالص رومانی ہے۔ جذبوں کا وفور اور تصور کی پرواز ان کے اشعار میں نئے گل بوٹے کھلاتی ہے۔ فکر و خیال نسائی رنگ سے لب ریز ہیں۔ فطرت کی دلکشی اور نزاکت کو نسائی کیفیات سے ہم آمیز کر کے انہیں شاعرانہ آہنگ بخشنے کا ہنر قابلِ تحسین ہے۔ مثلاً یہ اشعار توجہ کھینچتے ہیں :

Scanned with CamScanner

●

کیا دن تھے بہاروں کی قبا کھول رہے تھے
آنچل میں مرے قوسِ قزح گھول رہے تھے

●

مطلع بھی بہت صاف تھا اور دھوپ کھلی تھی
کھلتے ہی لفافے میں دھنک اور سجی تھی
منڈوے تھے چنبیلی کے نہ تتلی ہی اڑی تھی
اونچے تھے محل اور وہ گملوں میں سجی تھی

●

کتاب ، پھول؛ قلم سب خوشی خوشی رکھنا
کلی ،گلاب ،حنا درمیاں ہنسی رکھنا

●

اپنوں کی طرح آئے چپ چاپ گئے اپنے
صندل کے کٹوروں کی اک رسم نبھانا تھی

●

حنائی دست کو لہرا کے خوش فضاؤں میں
خوشی سے لوٹ کے آنے کا اک شگوں کرنا

●

جلیں یا کٹ کے رہ جائیں بس اک خوشبو کا وعدہ ہے
ملا اذنِ سفر صندل کی ساری خوبیاں بھر کر

●

اشکوں کی ہر اک رسم نبھانے کے لیے ہم
صندل کے کٹوروں میں انہیں گھول رہے تھے

Scanned with CamScanner

درج بالا اشعار میں خالص نسائی کیفیات کی عکاسی کی گئی ہے۔صندل کولڑکی کا استعارہ بنا کر سماج ومعاشرے کی سوچ کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کی نشتریت دل کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ ہر عورت کا مقدر اس معاشرے میں صندل کے پیڑ جیسا ہے۔ کٹے یا جل کے راکھ ہو جائے اسے بس خوشبو بکھیرتے رہنا ہے۔صغریٰ کے یہاں بھی اداس لمحوں اور تنہائیوں کی کسک ملتی ہے۔ایسے وقت میں یادوں میں کھوجانا بھی فطری ہے۔انہیں یادوں کے دھاگوں میں وہ امید کے موتی بھی پروتی ہیں:

●

خوشی ، خمار ، تبسم ، امید کی خوشبو
سرائے جاں میں کبھی بھول کر ٹھہر جاتے

●

اک بیل چنبیلی کی منڈوے پہ چڑھانا تھی
اور فصلِ گزشتہ کی تقریب منانا تھی

●

دوریوں کی دھوپ ہے اور دھوپ میں شدت بھی ہے
قربِ جاں کی چاندنی سے سر بسر کرنا مجھے

●

درد رکھا تو سمندر سے بھی گہرا رکھا
دل سے نکلی ہوئی ہر آہ پہ پہرا رکھا
کبھی یادوں کی تلاوت میں بھی مصروف رہی
رحل ہاتھوں کی بنا کر کبھی چہرہ رکھا

●

وہ جو دے رہا ہے قریب سے کسی روشنی کی ضمانتیں
مری چشم تر کی فصیل پر وہ چراغ اب بھی بجھا نہیں

●

Scanned with CamScanner

بہر کیف صغریٰ عالم کے اشعار میں تلازموں کا حسن جلوہ گر ہے۔ ہاتھوں کی رحل، یادوں کی تلاوت، چیخوں کا در بدر ہونا، شب کے لمحوں کا پگھلے ہوئے اولوں کی طرح ہونا، آنچل میں قوس و قزح کا کھلنا جیسی لفظی ترکیبیں شاعرہ کے شدید احساس حسن کی آئینہ دار ہیں اور ان کے اشعار کو دل نشین بناتی ہیں۔ صندل، پھول، خوشبو، تتلی اور حنا جیسے الفاظ نسائی شخصیت کی نزاکت اور نفاست اور جمالیاتی شعور کا مظہر ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی صغریٰ عالم کی غزلیں اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے انہیں ہم عصر شاعرات میں پر وقار مقام عطا کرتی ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

بلقیس ظفیر الحسن

بلقیس ظفیر الحسن کی ولادت ۱؍ ستمبر ۱۹۳۸ء میں موتیہاری (بہار) میں ہوئی۔ تعلیم ایم اے تک ہے اور شاعری و افسانہ نگاری ان کی تخلیقی سفر کے مشغلے ہیں۔ 'گیلا ایندھن' ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ۱۹۹۶ء میں منظر عام پر آیا۔ کلاسیکی شعر و ادب کا گہرا شعور ان کی نثر اور نظم دونوں میں چھلکتا ہے۔ شاعری میں بھی فنی اور لفظیاتی سطح پر یہ رنگ نمایاں ہے۔ ان کی غزلیں اپنے عصری مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ موضوعات کا تنوع، شدتِ احساس اور خیال کا نیا پن ان کے اشعار کی پہچان ہیں۔ زندگی کے مختلف مسائل اپنے وسیع تناظر میں اس طرح شعر کی صورت اختیار کرتے ہیں کہ کوئی تجربہ اجنبی نہیں محسوس ہوتا۔

غزل جذبات و کیفیات کی شاعری ہے اور جذبہ دل میں پرورش پاتا ہے۔ اسی سبب سے غزل حدیثِ دل بھی کہلائی۔ بلقیس کی شاعری بھی درد بھرے دل کی حکایت ہے لیکن تنہا شاعرہ کی ذات کی داستاں نہیں بلکہ عہدِ حاضر کے ہر زندہ، حساس انسان کا المیہ ہے۔ جذبہ اپنی شدید صورتوں میں احساس بن جاتا ہے۔ اور تب شاعری میں احساس کی فراوانی اپنے جلوہ دکھاتی ہے۔ بلقیس نے بھی جذبۂ دل کی سحر انگیز کیفیات کو بڑی رعنائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بالخصوص نسائی فطرت کے تقاضے، چاہے جانے کی آرزو اور دل سے جڑے یادوں کے منظر، غرض مختلف جھلملاتے رنگ دھنک کی طرح غزلوں میں موجود ہیں:

مری ہتھیلی پہ لکھا ہوا دکھائی دے
وہ شخص مجھ کو بہ رنگِ حنا دکھائی دے

Scanned with CamScanner

اسے جو دیکھوں تو اپنا سراغ پاؤں میں
اسی کے نام میں اپنا پتا دکھائی دے

●

ہماری جاگتی آنکھوں میں خواب کیسا تھا
گھنیری شب میں اگا آفتاب کیسا تھا
تمام جسم میں ہوتی ہیں لرزشیں کیا کیا
سوادِ جاں میں یہ بجتا رباب کیسا تھا

●

ہاتھ کیا آتا مگر اپنی سی کر لی میں نے
شیشۂ دل میں وہ مہتاب اتارا تو سہی

●

ترے بغیر کہاں زندگی گزرتی تھی
بچھڑ کے تجھ سے تجھے سوچنے میں گزری ہے

●

دیوار و در میں سمٹا اک لمس کانپتا ہے
بھولے سے کوئی دستک دے کر چلا گیا ہے

●

ہر دل عزیز وہ بھی ہے ہم بھی ہیں خوش مزاج
اب کیا بتائیں کیسے ہماری نہیں بنی

ان مثالوں سے قطع نظر بلقیس کی غزلوں کا غالب رجحان عصری مسئلوں کی پیش کش ہے۔ زندگی اور زمانے کی تلخیاں، طبقاتی ناہمواری، شکست خوردگی، نارسائی اور اکیلے پن کا کرب ان کی شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ماضی کے خوش نما تہذیبی آدرشوں پر یقین رکھتے

Scanned with CamScanner

ہوئے، آنکھوں میں بہتر زندگی کا خواب سجائے وہ امن اور دوستی سے معمور مستقبل کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔ عصری آگہی اور جرأتِ فکر انہیں فعال رکھتی ہے۔ مشکل اور مخالف صورتِ حال میں بھی ان کی آرزومندی اور انسانی عظمت پر ان کا وشواس ان کی گہری بصیرت کی شناخت ہے:

میری آنکھوں میں خواب رہنے دے
سیلِ غم یہ سراب رہنے دے

●

ویرانی سی ویرانی ہے
سارے گھر میں گھر ڈھونڈوں میں

●

ریت مٹھی میں بھر کے بیٹھے ہیں
ہاتھ میں کچھ رہے تو کھونے کو

●

آسماں تھا آگ پتھر تھی زمیں
تھی کہاں جائے مفر چلتے رہے

●

بس اک کھنڈر مرے اندر جئے ہی جاتا ہے
عجیب حال ہے ماضی میں حال ٹھہرا ہے

●

اک آگ سائبان تھا سر پر تنا ہوا
پل پل زمیں سرکتی تھی اور ہم روانہ تھے

●

ہم جسے سمجھے تھے پانی ریت تھی
تشنگی ! پھر کھا گئی دھوکا نظر

Scanned with CamScanner

دہشت زدہ زمین پر وحشت بھرے مکاں
اس شہرِ بے اماں کا آخر کوئی خدا ہے

●

چھتوں سے رسنے لگیں وحشتیں تو سب چونکے
کسے خبر تھی کہ گھر میں پنپ رہا ہے دشت

بلقیس فقط اپنے عہد کا منظر ہی نہیں دکھاتیں بلکہ ماحول کی جبریت اور بے حسی کے خلاف مزاحمت بھی کرتی ہیں۔احتجاج کی کہیں تیز اور کہیں مدھم آواز شاعرہ کے فکری شعور کی نمائندہ ہے۔جب مزاحمت کی چنگاری آگ بن کر لہو میں دوڑنے لگتی ہے تو کچھ کر گزرنے کی خواہش شدید ہو جاتی ہے۔ترقی پسندوں کا سایہ تحرک نسائی ذات کا حصہ بن کر جا بجا ان کے اشعار میں جھلکتا ہے۔ان کے یہاں بوسیدہ روایتوں کی مار جھیلتا نسائی طبقہ صدیوں کے آہنی دروازوں کو اپنے بل اور طاقت پر توڑنا چاہتا ہے۔بند لبوں کو آوازوں سے آشنا کرانے کا بھرپور جذبہ شاعرہ کی حساسیت اور بالغ نظری کا ثبوت ہے:

شل ہوئے ہاتھ ہمارے تو کوئی بات نہیں
برف کی سل کا یہ حصہ ذرا ٹوٹا تو سہی

●

چپ چپ جھیلتے رہنا کب تک بندِ زباں اب کھول کے دیکھ
کچھ تو نتیجہ نکلے گا ہی حرفِ صداقت بول کے دیکھ
سورج چاند ستارے سب اجیارے سے تیرا گھر بھر جائیں
تو کمرے کے کیل جڑے یہ دروازے تو کھول کے دیکھ

●

ناگ پھنی سے سایہ چاہا ریت سے پانی مانگا کیوں
دوش کسی کا کیا جھوٹے وشواس ہمارے اپنے تھے

Scanned with CamScanner

جل جل کر کیا کندن ہوتے کوئلہ بھئے نہ راکھ ہوئے
ہم کہ دھواں آنکھوں میں لگیں اور سانسوں میں گھٹتے رہتے ہیں

●

جل جل کے بجھ رہی ہے دھواں ہو رہی ہے آگ
کن گیلی لکڑیوں کو جلانے چلی ہے آگ

●

نفس نفس مرا شعلہ دھواں دھواں ہے وجود
خود اپنی ذات کے آتش کدے میں گزری ہے

●

ہیں سراپا ایک سوزِ رائگاں
گیلے ایندھن سے جلے ہیں عمر بھر

گیلی لکڑیاں نسائی ذات کا استعارہ ہیں۔ اپنے ہی آتش کدے میں دھواں دھواں رہنا جس کا مقدر ہے۔ بلقیس نے اپنے مجموعہ کا نام ہی 'گیلا ایندھن' رکھا ہے۔ جس سے ان کی شاعری کے موضوعات کا خوب اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس کی مناسبت سے آگ، شعلہ، دھواں ، راکھ، دیپک، چراغ جیسے تلازموں کا استعمال کیا ہے۔ نسائی ذات کے کئی نئے اور چونکا دینے والے منظر پیش کیے ہیں۔ شاعرہ کی وسعتِ فکر اور گہرے جمالیاتی شعور کے ساتھ ان کے اندازِ بیان کی تازہ کاری ان کی غزلوں کے اہم اوصاف ہیں۔ کہیں فارسی تراکیب کا دلکش استعمال اور کہیں ہندی لفظوں کا آہنگ ان کے اشعار میں نغمگی بھر دیتا ہے۔ فارسی تراکیب کے حسن سے لب ریز چند اشعار دیکھئے :

ہیں حسرتوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے
یہ شہرِ آرزو بھی مرا کیا عراق تھا

●

Scanned with CamScanner

ایک اک زخم سے دل کھول کے ملتے تھے کہ ہم
لذتِ درد پہ جاں دیتے تھے بسمل کب تھے

●

یوں بھی کوتاہ تھا وہ دستِ عطا کیا دیتا
اور ہم بھی کسی انعام کے قابل کب تھے

●

ہمیں تو موت بھی دے کوئی کب گوارا تھا
یہ اپنا قتل تو بالقصد بالارادہ کیا

●

دیدۂ تر بھی آج کھو آئے
اس کے آگے گئے تھے رونے کو

●

اب تو چلیے کہ دیر سے بلقیسؔ
آبلہ پائی راستہ دیکھے

شہر آرزو کی عراق سے تشبیہ، لذتِ درد پہ جان دینا، دستِ عطا کی کوتاہی اور آبلہ پائی کا راہ دیکھنا، جیسے تجربے اپنے انوکھے پن کے سبب توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اب چند مثالیں آہنگ سے پر ہندی لفظیات پر مشتمل اشعار کی دیکھئے:

دیپک دیپک روز جلوں ہوں
روز دھواں ہو کر بکھروں ہوں

●

دیپ کٹوری سی لو اپنی کم ہی سہی میری اپنی ہے
سورج پیالوں کا کیا آنگن آنگن میں چھلکے رہتے ہیں

●

Scanned with CamScanner

سات سمندر پار اترے تو سات سمندر آگے پائے
من مانجھی ! پتوار اٹھا چل پھر طوفان سے لڑنا ہوگا

●

تو ہی نیا تو ہی کھویّا پار اتار کہ مجھ کو ڈبو دے
میں تو بس لہروں میں کھیلوں بھنور بھنور چکرانا جانوں

●

اپنے دیس میں پردیسی ٹھہرائے گئے وہ بے گھر ہم
کیسے پرائے پن میں بسے آنگن چوبارے اپنے تھے

●

بہر کیف بلقیس ظفیر الحسن کی غزلیں کلاسیکی روایت کے رچے ہوئے شعور اور جدید نسائی حسیت کی ہم آہنگی دل فریب مثال ہیں۔ موضوعات کا تنوع، شعری پیکر کا حسن اور موسیقیت آمیز اسلوب ان کی باشعور اور فعال شخصیت کا عکاس ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

مریم غزالہ

مریم غزالہ گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبے رادھن پور میں ۱۱ر مارچ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی مادری زبان گجراتی ہے۔ شوہر کے ساتھ چند برسوں حیدرآباد میں قیام کے سبب ان کا شاعرانہ ذوق نمو پا کر نکھر آیا۔ حیدرآباد جو کئی صدیوں سے اردو شعر و ادب کا اہم مرکز ہے، اس شہر نے مریم غزالہ کی کچھ اس طرح حوصلہ افزائی کی کہ وہ ایک گجراتی بولنے والے قصبے میں اردو کا پرچم بلند رکھے ہوئی ہیں۔ جہاں بہ مشکل پانچ فی صد لوگ اردو بولنے والے ہیں۔ انہوں نے ایم اے۔ ایم ایڈ تک تعلیم حاصل کی اور رادھن پور کے اردو اسکول کی معلمہ بن گئیں۔ سورت اور احمد آباد جیسے شہر اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اردو شعر و ادب سے غزالہ کی گہری انسیت ان کے علمی بصیرت اور جمالیاتی شعور کی دین ہے۔ اپنے اولین شعری مجموعہ 'کانچ کی چادر' کے ذریعہ انہوں نے اپنی شناخت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

غزالہ فطری شاعرہ ہیں اور جدید رنگِ تغزل سے متاثر ہیں۔ اس کا سبب شاید مختلف معیاری اردو رسائل کا مطالعہ ہے جس سے نہ صرف ان کے شاعرانہ ذوق کی تسکین ہوتی ہے اور ہم عصر شعرا کے کلام سے فیض حاصل ہوتا ہے بلکہ شعر گوئی کے ہنر کو بھی جلا ملتی ہے۔ قیام حیدرآباد کے دوران انہوں نے علی احمد جلیلی جیسے کہنہ مشق شاعر سے اصلاحِ شعر کے لئے رجوع کیا۔ غزالہ کی فطری شعر گوئی کے سبب ابتدا سے ہی ایسے اشعار کی تخلیق ہوئی جنہیں پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعرہ کے لیے اردو زبان نئی اور اختیاری ہے۔ مجموعہ کا پہلا شعر ہی توجہ کھینچتا ہے:

کانچ کی چادر بچھی تھی ہر طرف
میں نے تلووں کو مگر یہ بات سمجھائی نہیں

Scanned with CamScanner

غزالہ زندگی سے خلوص، یقین، سکون اور حسن کی طلب گار ہیں۔ وہ زندگی کی مسرتوں پر اپنا حق سمجھتی ہیں اور اسے دوسروں میں بھی بانٹنا چاہتی ہیں۔ یہ وسیع المشربی ان کے خیال وفکر کو کائنات بھر کر دیتی ہے۔ ان کے یہاں کلاسیکی شعری روایت کا احترام بھی ہے اور جدید حسیت کا شعور بھی۔ ان کی غزلوں میں جہاں جذبۂ دل کی مختلف کیفیات ہیں وہیں زندگی کے مسئلے اور الجھنیں بھی تلخ سچائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ اپنی شدید داخلیت کے سبب وہ زمانے کے دکھ درد کو بھی اپنے باطنی احساسات سے آمیز کر کے اشعار کی صورت گری کرتی ہیں۔ ان کا تخلیقی شعور ان کے اشعار کو تمام انسان کی زندگی کا کینوس بنا دیتا ہے:

●

ہر ایک قلب پر اک زخم اک ستارا ہے
کبھی تو موت کبھی زندگی نے مارا ہے

●

اور کوئی جو نہیں خود کو سہارا سمجھو
رات کالی ہو تو آنکھوں کو ستارا سمجھو
تھک کے بیٹھو گے تو ٹھکرا کے چلے گی دنیا
اپنے جیون کو بھی بہتا ہوا دھارا سمجھو

●

در و دیوار پر پرچھائیاں آتی تھیں نظر
بات کرنے کو بھی ترسی ہوں سحر ہونے تک

غزالہ گردشِ حالات کی زد میں رہ کر بھی حوصلہ نہیں ہارتیں بلکہ مسئلوں سے لگاتار نبرد آزما رہتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں سیاسی جبر، معاشرے کی تلخیاں، مکر وفریب، بے حسی اور ناانصافی کا بے باک اظہار ملتا ہے۔ گوکہ ایسے خیال وفکر کی ادائیگی میں وہ جمالیاتی کیف تو نہیں جو غزل سے عبارت ہے لیکن بیان سادگی اور شائستگی کے ساتھ زبان کی روانی دلفریب ضرور ہے۔ چند اشعار اس طرح ہیں:

Scanned with CamScanner

کل نہ جانے شہر میں کس بات پر جلسہ ہوا
آج سارے شہر کا نقشہ ہے کچھ بدلا ہوا
اک تماشہ ہے غزالہ آج یہ انسانیت
کون آئے گا بجھانے یہ مکاں جلتا ہوا

●

وہ ایک شخص جو دہرا ہوا ہے سجدوں میں
نہ اس نے یاد کیا تھا کبھی خدا برسوں

●

ایسے بھی جادوگر تھے کئی لوگ بھیڑ میں
جو دوسروں کی جیب میں سیدھے اتر گئے

●

ہم تو سمجھے تھے ہمیں پہچانتا کوئی نہیں
اپنی بربادی تو گھر گھر کی کہانی ہوگئی

●

ہر قدم کو سوچ کر رکھئے گا اب
حادثہ ہے راہ میں چلتا ہوا

●

مریم غزالہ کا شاعرانہ مزاج حسن وتہذیب سے بھرپور ہے۔ جذبۂ عشق کی مختلف کیفیات میں ہجر اور قرب کی آرزومندی کے ساتھ یاسیت کی فضا ہے۔ اشعار نغمگی سے لب ریز ہیں۔ سادہ اور سبک لفظوں میں رمزیت کے ساتھ اپنے احساسات کو پیش کرنے کے ہنر سے وہ باخبر ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

کھنڈر ہوئی اس طرح دل کی یہ بستی
زمانہ بیت گیا اب کسی کی راہ نہیں

Scanned with CamScanner

•

جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک کر
دائرہ اٹھتی ہوئی لہروں کا ہم دیکھا کیے

•

کہیں دشت تھا کہیں وادیاں کہیں بستیاں کہیں ندیاں
ترے نقش پا کی تلاش میں جو یہاں وہاں سے گزر گئے
تھے جو فاصلے شب و روز کے تری جستجو میں جو طئے ہوئے
تری رہ گزر تھی جہاں جہاں تو وہاں وہاں سے گزر گئے

•

پربتوں کی اوٹ میں اک جھیل ہے سوکھی ہوئی
پیاس بھی ان پتھروں کی اب پرانی ہوگئی

•

اب کے غزآلہ ساون میں ہم رم جھم رم جھم برسیں گے
آنکھوں کے کورے صحرا میں چلنے تو دو پروائی

درج بالا اشعار میں فطری حسن جیسے جھیل میں دائروں کا اٹھنا، پربتوں کی اوٹ میں اک سوکھی ہوئی جھیل یا پھر آنکھ کا کورا صحرا اور اس میں پروائی چلنے کی آرزو، ایسے شعری منظر توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ ان اشعار کا آہنگ اور احساس کی سبک روی متاثر کن ہے۔ غزآلہ کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ وہ چھوٹی اور رواں بحروں کا استعمال خوب صورتی اور کامیابی سے کرتی ہیں۔ اپنے جذبات اور احساسات کو فطری منظر کے رنگوں میں گھول کر پیارے پیارے موہنے شعر تخلیق کرتی ہیں:

پھر کہاں نیلا سمندر کھو گیا
سرمئی صحرا یہ کیسے ہوگیا
ڈوبتے دل کا نظارہ کیا کہیں
جو بھی آیا دیکھنے وہ رو گیا

Scanned with CamScanner

●

ایک ہی در سے واسطہ ہے ہمیں
آرزو در بدر نہیں ہوتی

●

اے گھٹا روک لے بارش اپنی
آنکھ ان کی بھی تو بھر آئی ہے
آج خوشبو ہے فضا میں کیسی
ان کے کوچے سے صبا آئی ہے

●

راز کی بات کھل نہ جائے کہیں
اس سے کہنا مری خبر تنہا
محفلیں میرے پیچھے آئیں گی
میں چلی جاؤں گی مگر تنہا

●

تیری دہلیز کا ہر اک پتھر
مجھ سے ناآشنا رہا کیسے

●

ایک دو پل میں ہمیں جانو گے کیا
اس کی خاطر اک زمانہ چاہئے

بہر کیف درج مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو زبان مریم غزالہ کے لیے اختیاری ہوتے ہوئے بھی ان کی تخلیقی شخصیت میں گھل مل کر شعری اظہار کی راہ پا گئی ہے۔ جس سے اردو شعر وادب کے تئیں ان کے ذوق اور جنون کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعرانہ کاوشیں قابل تحسین ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

فاطمہ وصیّہ جائسی

فاطمہ وصیّہ جائسی کی جائے پیدائش جائس ہے۔ اپنے والد سید وراثت حسین نقوی کے ساتھ کم سنی میں ہی لکھنوء میں قیام پزیر ہوئیں۔ شادی کے بعد نہ صرف تعلیمی سلسلہ برقرار رکھا بلکہ اردو شعر وادب سے والہانہ لگاؤ کے سبب اردو میں ایم اے کیا۔ وصیّہ کے نانا سید رضی حسن ایک جید عالم ہونے کے ساتھ ہی ایک پر گو شاعر بھی تھے۔ ایسے ادبی ماحول میں پرورش پانے کے سبب وصیّہ کی شعر گوئی کو راہ ملی۔ گیارہ سال کی عمر میں شاعری کی شروعات ہو گئی اور ایک نوحہ حضرت زینب کی شان میں کہہ ڈالا۔ ان کی ابتدائی شاعری نوحے اور قصیدے پر مشتمل ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ غزل کے سحر نے رنگ دکھانا شروع کیا اور وہ پھر اسی کی ہو رہیں۔ یوں بھی صدیوں سے غزل کا جادو اس طرح سر چڑھا ہے کہ جو اس کی وادی میں آتا ہے اسی کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ فاطمہ وصیّہ جائسی بھی اسی وادیِ پرخار کی مسافر ہیں۔

فاطمہ وصیّہ کی کہنہ مشقی کا ثبوت ان کے چار مجموعے 'ریزہ ریزہ حیات' 'قطرہ قطرہ سمندر' 'طرزِ گفتگو' اور 'بچپن' ان کی طویل شعری مسافت کے سنگِ میل ہیں۔ ان کی غزلوں کا بنیادی موضوع غمِ ذات ہے۔ غم جو انسان کا ازلی مقدر ہے اور بیکراں ہے۔ یہی بے کرانی اسے موجِ بلا سے لڑنے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے، آگے بڑھے چلنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے اور زندگی کرنے کا ہنر بھی بخشتی ہے۔ وصیّہ اسی غم کو زندگی کا اثاثہ بھی جانتی ہیں۔ اسے وہ اپنی حساس نسائی ذات کی فطری نرمی اور گداز میں گوندھ کر شعر میں مجسم کر دیتی ہیں:

ہزار زخم نچھاور ہوں گھاؤ ایسا ہو
سمجھ نہ پائے کوئی رکھ رکھاؤ ایسا ہو

Scanned with CamScanner

دل میں طوفان رہیں اور سکوں ساحل پر
ہم کو معلوم ہے کوزے میں سمندر ہونا

●

سر جھکانا مری فطرت کے منافی ۔ ہے مگر
ان کو یہ ضد ہے کوئی بن کے سوالی آئے

●

ان اشکوں کی محرومی بھی دیکھی ہے کسی نے
جو آنکھ میں آتے ہیں مگر بہہ نہیں سکتے

●

ہاتھوں میں ان کے سنگِ گراں آج بھی وہی
مجھ کو محبتوں کا گماں آج بھی و ہی

●

شرطِ وفا یہی ہے وصیت کہ زیست میں
ہر وقت اشکِ غم سے تری آنکھ تر رہے

●

مفلس کا جس طرح سے جلے شام کو چراغ
د ل بس اسی طرح سے ہمار ا جلا کیا

●

کرم کا سلسلہ جاری بہت ہے
اسی سے خوف سا طاری بہت ہے

●

آ ؤ اب غم کو میہماں کر لیں
سونا سونا سا دل کا آنگن ہے

Scanned with CamScanner

غم ایک نشے کی طرح ان کے اشعار کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اگر چہ اردو شاعری کی بنیاد میں ہی غمِ عشق شامل ہے لیکن وصیہ کے اشعار میں جس بے وفا محبوب کا پیکر ابھرتا ہے وہ ان کے شریکِ سفر کا ہے۔ شاعرہ تو شرطِ وفا نبھانے سے کبھی گریز نہیں کرتیں مگر جب محبوب کے دماغ میں شک وشبہات بسیرا کرنے لگیں اور اس کی بدگمانی سنگِ گراں بن جائے تو شکایت کرنا شاعرہ کا حق بن جاتا ہے۔ غزل گو شاعرات میں حقیقی ہم سفر کی بے اعتنائیوں کے خلاف احتجاج کی پرسوز آواز وصیہ کا شاعرانہ وصف ہے۔ اشعار اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

شک کی بنیاد پر جب گھر کو بنایا جائے
کس طرح پھولوں سے گلشن کو سجایا جائے

●

تمام عمر رفاقت میں کاٹ دی میں نے
مگر شریکِ سفر تو نے کیا دیا مجھ کو

●

قاتل وہی ہوا ہے وصیہ نصیب سے
جس کا کبھی شمار مرے چارہ گر میں تھا

●

اکثر اسی خیال سے راحت ملی مجھے
اپنا نہیں ہے پر وہ سلامت کہیں تو ہے

●

کشتی ڈبو دی ساحلِ امید کے قریب
مجھ کو اگر گلے ہیں تو سب ناخدا سے ہیں

●

جیسے مرا وجود ہی باقی نہ ہو کہیں
کچھ اس طرح سے اس نے فراموش کر دیا

Scanned with CamScanner

غم پرائے نہیں اپنے ہیں وصیہؔ سچ ہے
ہم نے جو بات لکھی دل کی زبانی لکھی

●

فاطمہ وصیہؔ کے اشعار کے ذریعہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے غم کی حکایت اردہ شاعری کی روایت سے مستعار نہیں بلکہ وادیٔ جاں میں انہوں نے خود طوفانوں کے قہر جھیلے ہیں۔ ساحل امید کے قریب جس ناخدا نے کشتی ڈبودی وہ ان کا شریک سفر ہے۔ جس کا ہاتھ تھام کر انہیں زندگی کی کٹھن ڈگر پر چلنا تھا۔ لیکن جب ہوا مخالف ہو، چراغ بجھنے لگیں، تاریکیاں جال بننے لگیں، خواب کھلنے کے پہلے ٹوٹ جائیں، دکھ اور نارسائی زندگی کا حاصل ٹھہرے تو ملال کا موسم دل وجاں پر مسلط ہو جاتا ہے پھر شاعری شخصیت کے باطنی شکست و ریخت کا اشاریہ بن جاتی ہے۔ شاعرہ نے بھی اپنے تجربوں اور کیفیتوں کو شاعرانہ زبان بخشا ہے اور سچائی کے ساتھ درد رتوں کے احوال سنائے ہیں:

جب گزرتی ہے آزمائش سے
زندگی اک سزا بھی ہوتی ہے

●

یوں ٹوٹ کے بکھروں گی نہ معلوم تھا دل کو
یہ وہم کہ وہ مجھ کو منانے کے لئے تھا

بہر کیف وصیہؔ فاطمہ جائسی کی غزلیں ان کے ذاتی غم کی کامیاب ترجمان ہیں۔ شدتِ جذبات اور خیال کے وفور کے ساتھ لفظوں پر ہنر مندانہ گرفت شعری روایت کے گہرے شعور کی عکاس ہے۔ زبان دردانگیز اور پرتاثیر ہے جو قاری کی توجہ کھینچ لیتی ہے۔ روایتی رنگ کے باوجود اپنے تجربوں کی سچائی کے سبب ان کی غزلیں انہیں معتبر شاعرہ کی صف میں شامل کر دیتی ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

حسنیٰ سرور

حسنیٰ سرور کی ولادت جون ۱۹۳۹ء میں ان کے آبائی وطن ہاسن، ضلع میسور میں ہوئی۔ ۱۹۵۱ء سے ان کی تخلیقات ہندوپاک کے معتبر رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ کیوں کہ آٹھ، نو سال کی عمر سے ہی شعروادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اپنی تخلیقی شخصیت کا اظہار انہوں نے کئی اصناف میں کامیابی سے کیا۔ افسانوں کا مجموعہ ۱۹۸۹ء میں 'برف کے پھول' کے نام سے اور ناول ۱۹۶۸ء میں 'سیما' کی صورت میں شائع ہوا۔ یوں بیسویں صدی کے نصف کی سرحد پر آ کر اردو کے شعری منظرنامہ میں اپنا نام درج کرانے والی شاعرات میں ایک اہم اور معتبر شخصیت حسنیٰ سرور کا تعلق ارضِ دکن سے ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے بنام "خواب زار" ۱۹۷۲ میں، "ایک چاند چمکتا ہے" ۱۹۷۸ میں "شبنم شبنم" ۱۹۸۶ اور "ساون برسے" ۲۰۰۰ میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دو ناول 'سلیم' اور 'اے غم یار' ایک ناولٹ 'تشنگی' اور حمد و نعت پر مشتمل ایک مجموعہ اشاعت کے مرحلوں سے گزرنے کو تیار ہے۔

حسنیٰ سرور نے اپنی تخلیقی توانائی کے اظہار کے لئے نظم، گیت اور غزل کی ہیئت کو منتخب کیا ہے۔ ہر صنف ان کی ہنرمندی کا خوب صورت ثبوت ہے۔ میں نے اس مضمون میں ان کی غزلوں کا جائیزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اردو غزل کی روایت عشق سے منسوب رہی ہے۔ عشق ایک فطری اور آفاقی جذبہ ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے پامال ہونے کے باوجود زندگی کی اہم اور بنیادی قدر رہونے کے سبب شعروادب کے لئے ناگزیر ہے۔ حسنیٰ سرور کی فن کاری یہ ہے کہ انہوں نے عشق اور اس کے تجربات وکیفیات کو زندگی کا لازمی جز جان کر تغزل کا ریشمی لباس بنا دیا ہے۔ ان کی غزلیں بنیادی طور پر فنی اقدار کے ساتھ ساتھ زندگی کی نئی اشاریت کی ترجمان ہیں۔ دل کے بہتے سمندر کی موجیں ہیں جو اپنے زیر و بم کے ساتھ اشعار میں ڈھل گئی ہیں۔ عہدِ حاضر میں جب

Scanned with CamScanner

انسان کی وابستگی باہری دنیا سے زیادہ بڑھ گئی ہے، حسنیٰ دل کی طلسمی وادیوں کی سیر کرنے لگتی ہیں اور پھر ان جلتے بجھتے منظروں کو شعر میں مصور کر دیتی ہیں۔ جس کے سبب کہیں طربیہ تو کہیں حزنیہ رنگ کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں:

حسنِ تغزل میں حسنیٰ سوزِ جگر یوں سایہ فگن ہو
جیسے شمع کہیں جلتی ہو جھلمل سی مدھم مدھم

●

دیکھنا وادیٔ دل سے مجھ کو
کوئی آواز تو دیتا ہوگا

●

کتنے کومل دل گھائل ہیں کوئی نہیں جانے حسنیٰ
پیار کی رنگیں بستی میں چاند کی شیتل چھاؤں میں

●

وادیٔ درد میں جانا ہے اگر تجھ کو صبا
برگِ آوارہ ہوں آ مجھ کو اڑا کر لے جا

●

تری نگاہ میں یہ جو کرن سی کانپتی ہے
دیارِ دل میں یہ کیسا چراغ جلتا ہے

●

یہ کس کی نوازش سے ملی درد کی دولت
پہلو میں دھڑکتا ہوا دل درد بنا ہے

●

اندھیرے جگمگا اٹھے مرے غم خانۂ دل کے
مری پلکوں پہ آنسو ہیں کہ انگارہ دہکتا ہے

●

اک سوکھے شجر کا سایہ کیا جلتی ہوئی دھوپ ہے سرمایہ
چھاؤں بھی نہیں ہے پلکوں کی ایسے میں بھلا ستائیں کیا

Scanned with CamScanner

درد کی چٹانوں پر ٹوٹ کے جو بکھرے تھے وہ مرے سہانے خواب
آج بھی سلامت ہیں میری بند پلکوں میں کانچ بن کے چبھتے ہیں

●

مذکورہ اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حسنیٰ نے غمِ عشق کو زندگی کا سرمایہ جانا ہے۔ وہ اس سے فرار نہیں چاہتیں بلکہ اسے جینے کا بہانہ بنا لیتی ہیں۔ درد کا یہ رجائی پہلو ان کی شاعری کو اثر انگیز اور پرکشش بنا دیتا ہے۔ درد ان کے یہاں باعثِ کیف و شادمانی ہے جو زندگی کے نشیب و فراز میں تحرک اور توانائی بن کر شاعرہ کا ہم سفر ہے۔ یہی جذبے کو شدت اور گہرائی بھی بخشتا ہے اور ان کی شاعری میں روح پرور فضا کا محرک بھی ہے۔ ان کے شاعرانہ تخلیقی عمل کے اظہار میں بھی ایک قسم کا تحرک ہے جو ان کے اشعار میں حرکی تصویروں کی صورت ابھرتا ہے۔ جیسے شمع کی مدھم جھلملاہٹ، درد کی چٹانوں پر خواب کا ٹوٹ کر بکھرنا، دھڑکتا دل، برگِ آوارہ کی صورت اڑنا، کرن سی کانپنا، انگارہ دہکنا، مشعل بدست چلنا وغیرہ۔ ایسی مثالیں ان کی غزلوں کی آراستگی میں اضافہ کا سبب ہیں، ہی ساتھ ہی ان کے تصورات و تجربات اور جمالیاتی مزاج کی آئینہ دار بھی ہیں۔ زندگی کے سرد و گرم حالات کے باوجود ان کا تخلیقی رابطہ رومانی جذبوں اور جمالیاتی کیف سے برقرار رہتا ہے۔ یادیں صنفِ غزل کا ناگزیر حصہ رہی ہیں۔ حسنیٰ سرور کے یہاں بھی ان کی حیثیت سرمایۂ حیات کی ہے جن سے احساس کی دنیا پر کیف اور خواب آلود رہتی ہے۔ چند اشعار میں یادوں کی سرشاری دیکھئے:

جھیل میں چاندنی کا عکسِ جمیل
یا تری یاد دل سے گزری ہے

●

اب تری یاد بھی یوں آتی ہے
گزرے موسم کی صدا ہو جیسے

●

یاد آئی ہے سرِ شام گلے ملنے کو
کیسے معلوم ہوا تجھ کو کہ میں تنہا ہوں

Scanned with CamScanner

خوشبو سی کوئی سوئے قفس آنے لگی ہے
شاید کہ کسی نے مجھے پھر یاد کیا ہے

●

بیٹھے بیٹھے یوں ہی تنہائی کے صحراؤں میں
درد کی ریت پہ لکھتے ہیں ترا نام اکثر

●

اور محبوب سے قرب کے لمحوں میں شاعرہ کی یہ آرزومندی کتنی دل فریب ہے:

دل کے آنگن میں اندھیرا ہے بہت
چاند بن کر اتر آؤ تو سہی

●

مجھ کو اپنی پناہ میں لے لو
برگ گل سی بکھر نہ جاؤں کہیں

●

آنکھوں سے تمہیں دل کے شیشے میں بسا تو لوں
کچھ اور ذرا دیکھوں کچھ اور ٹھہر جاؤ

●

یہ ایک پل بھی غنیمت ہے آؤ مل بیٹھیں
مرے حبیب سنا ہے کہ زندگی کم ہے

●

ایسا نہیں کہ حسنیٰ سرور نے عشقیہ کیفیات کو ہی غزل کا موضوع بنایا ہے بلکہ ان کا سماجی اور تہذیبی شعور انہیں عصری حالات سے بھی باخبر رکھتا ہے۔ اپنے عہد کی حسیت بھی شاعرہ کی فکر اور جمالیاتی روئے سے آمیز ہو کر غزل میں ڈھل گئی ہے۔ دلوں کے درمیان بڑھتے فاصلے، ٹوٹتے رشتوں کا دکھ، بے رخی، اجنبیت، منافقت اور دربدری جیسی سچائیوں کی تصویریں بھی ان کی غزلوں میں عیاں ہیں:

Scanned with CamScanner

حیراں ہوں تجھے دیکھ کے تو ہے کہ یہ میں ہوں
یہ کس نے مرے ہاتھ میں آئینہ دیا ہے
جس شخص کو دیکھو تو یہ لگتا ہے کہ جیسے
اوراقِ پریشاں کی طرح بکھرا ہوا ہے

●

شہر در شہر بھٹکتے ہی رہے عمر تمام
کیا ترے ہاتھ کی ریکھاؤں میں آرام نہیں

●

پرسشِ غم کی بھلا کس کو ہے فرصت حسنیٰ
دوست ملتے ہیں تو کترا کے نکل جاتے ہیں

●

کنارِ آب شکستہ سی کشتیوں کی طرح
پڑے ہوئے ہیں ہم ویران بستیوں کی طرح

●

کسے اپنائیت کا واسطہ دیں
یہاں ہر شخص جیسے اجنبی ہے

●

پیلے چہرے، ویراں آنکھیں، سوکھے اور پژمردہ لب
ہائے کس نے چھین لیے ہیں قوسِ قزح کے ساتوں رنگ

●

چھپائے پھرتے ہیں دامن میں لوگ چہروں کو
کہ جیسے چہروں پہ سب دل کا حال لکھا ہے

●

Scanned with CamScanner

یہ اشعار حسنؔ کے پختہ شعور اور سماجی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ غزل کا اسلوب فن کار کی شاعرانہ جدتِ خیال اور جمالیاتی روئے کی شناخت کا اہم وسیلہ ہے۔ لفظوں کا انتخاب، احساس کی شدت، خیال کی پرواز اور فکر کی تازگی جمالیاتی شعور کے ساتھ گھل مل کر دلکشی کی تعمیر کرتے ہیں۔ شاعرہ کا اسلوب ان کی ہنر مندی کا مظہر ہے۔ مترنم آہنگ میں عام فہم الفاظ کو سمونا اور کلاسیکی رچاؤ عطا کرنا ان کا اہم وصف ہے۔ چھوٹی بحروں کا خوب صورت استعمال جذبے کی روانی اور لفظی پیکروں کے حسن سے دل نشیں نظر آتا ہے:

دور تک جاگتا ہے سناٹا
کون آتا ہے اتنی رات گئے

●

سکوتِ شب کا دل دھڑکا یکایک
یہ کس نے دور سے آواز دی ہے

●

دامنِ دل بچایئے ورنہ
آگ لگ جائے گی بہاروں سے

●

ایک جھنکار سی فضا میں ہے
کس نے زنجیرِ غم ہلائی ہے

●

چھن سے اک مورتی کہیں ٹوٹی
ہاتھ یہ کس کے تھرتھرائے ہیں

●

دوشِ صبا پہ آئی جو زنداں میں پنکھڑی
چوما قفس نصیب نے مکتوب جان کر

●

Scanned with CamScanner

جاگی کرنیں تو سبزے پر جھلمل آنسو بول اٹھے
رات کو تنہائی میں شبنم چپکے چپکے روئی ہے

●

سطحِ دل پر ہے کسی یاد کا پرتو ایسے
جیسے شیشے پہ چمکتی ہوئی بارش کی بوند

●

مشعل بدست کوئی مرے ساتھ چل پڑا
تاریک وادیوں سے مرا جب گزر ہوا

●

میں اپنی ذات میں گم بے خودی میں رہتی ہوں
صبا کی طرح کوئی چھیڑ ے گدگدائے مجھے

●

یاد کی انگلی تھام لو حسنیٰ
دل میں خوابوں کی چاندنی سی ہے

●

'ایک چاند چمکتا ہے' حسنیٰ سرور کی شاعرانہ ہنرمندی اور فطری رومانی مزاج کا عکاس ہے کہ انہوں نے روایتی موضوعات کو بھی دلاویز بنا دیا۔ ان کی طبیعت کے گداز اور تحمل کے سبب لہجہ دردانگیز اور مدھم ہے۔ جس کی غنائیت اور پرکیفی قابلِ تحسین ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

عرفانہ عزیز

عرفانہ عزیز کی ولادت ۱۵ر فروری ۱۹۴۱ء میں کراچی میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں سینٹ جوزف کالج، کراچی سے بی اے اور ۱۹۵۸ء میں جامعہ کراچی سے اکنامکس میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۲ء میں سرسید گرلز کالج، کراچی سے بطور معلمہ وابستہ ہوئیں اور ۱۹۷۱ء تک صدر شعبۂ معاشیات رہیں۔ ۱۹۷۱ء میں جناب لئیق ریاض سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوکر کناڈا چلی گئیں جہاں ان کے شوہر شعبۂ تعلیم میں ملازمت کرتے تھے۔ وہاں رہتے ہوئے انہوں نے تاریخ معاشیات میں مینی ٹوبا یونی ورسٹی سے امتیاز کے ساتھ ڈگری بھی لی اور اسی یونی ورسٹی میں تین سال تک فنون لسانیات کی تعلیم دیتی رہیں۔ سیاحت سے گہرے لگاؤ کے سبب تمام یوروپی ممالک اور امریکہ کے زیادہ تر شہروں کی سیر کر چکی ہیں۔

عرفانہ عزیز کا شعری سفر ترقی پسند تحریک کے زوال آمادہ دور میں شروع ہوا جب جدیدیت اپنے سراپے کی تشکیل میں مصروف تھی۔ وہ کسی مخصوص نظریہ یا مسلک سے کبھی وابستہ نہیں ہوئیں بلکہ اپنے فن کی اساس ایسی دوامی قدروں کو بنایا جو آفاقی اور عالم گیر تھیں۔ ذہنی افق کی وسعت نے ان کی شاعری کو فکر واحساس کی وہ بے کرانی عطا کی جوذات کی سطح سے اوپر اٹھ کر کائنات کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''برگِ ریز'' ۱۹۷۱ء میں اور ''کفِ بہار'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوکر ان کے تخلیقی اور جمالیاتی تشخص کی شناخت بن چکا ہے۔ ''برگِ ریز'' کے حرفِ آغاز میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''عالم گیر انسانیت کی وحدت وہ دل آویز خواب ہے جو فن کار کی چشم باطن کو صدرنگ تابانیاں عطا کرتا ہے۔ دل پرخوں کا گداز اور دردمندی کا احساس

Scanned with CamScanner

سخن سنج کو انسان کی اس فطری معصومیت نے بخشا ہے جو بدی کو سر بلند پا کر بھی نیکی کی عظمت کی منکر نہیں ہوتی اور ہمیشہ سچ کی دائمی فتح کی پیشن گوئی کرتی ہے۔"

عرفانہ کی شاعری اسی خواب کی تابناک تفسیر پر محیط ہے۔وہ غم ذات میں تہہ بہ تہہ اتر کر آفاقی حقیقتوں کا عرفان سمیٹ لاتی ہیں عشق کا جذبۂ بے کراں عالم گیر بھی ہے اور تغزل کا بنیادی حسن بھی۔وہ عشق کی سرفرازی کو فطری شائستگی اور لطیف جمالیاتی رویہ کی صورت شعر کے پیکر میں ڈھال دیتی ہیں۔ان کا تغزل چراغ دل کے نور سے منور ہے۔ وہ شبِ غم کو سحر کے اجالوں سے آشنا کرنے کا ہنر جانتی ہیں یہ ہنرمندی ان کی وسیع المشربی اور بے کراں تخیل کی دین ہے۔وجود کی قوت کا احساس انہیں حوصلہ دیتا ہے اور ان کا رومانی آدرش زندگی کے تجربات وکیفیات کی دل آویز تصویریں بناتا ہے:

یہ شہر دشت تھا تیرے ورود سے پہلے
دیارِ دل میں شگوفے کھلے نہ تھے ایسے

●

اس درجہ دل نواز تھی شہرِ وفا کی دھوپ
دل بے نیاز سایۂ دیوار ہو گیا

●

دیکھا تجھے تو رنگ پسِ رنگ تھی نظر
یہ سلسلے بھی دل کے چمن در چمن رہے

●

عرفانہ عزیز کی غزلوں میں عشق کی کئی جہتیں ہیں۔اول تو وہ محبوب ہے جسے روبرو پا کر نگاہیں حجاب آلودہ ہو جاتی ہیں اور آنچل میں قوس وقزح کے رنگ بھر جاتے ہیں۔خوشبوئیں رقص کرتی ہیں اور خاموشی بھی کھنک دار لہجے میں بول اٹھتی ہے:

Scanned with CamScanner

ہر سمت فروزاں ہیں خد و خال تمہارے
یوں آئینہ خانے پہ جمال آنے لگا ہے

●

جب تجھے یاد کیا رنگ بدن کا نکھرا
جب ترا نام لیا کوئی مہک سی بکھری

●

فسانہ کہتی ہوئی خامشی میں گونجی ہے
تری نگاہ کسی حرفِ دل نشیں کی طرح

●

آنچلوں کی خوشبو میں کوئی رنگ سا چھلکے
موتیے کی کلیوں کو نیم خواب سا دیکھوں
میں آنسوؤں کا چراغاں لیے کہاں جاؤں
کہ ساتھ ساتھ ہے بن اور چاند سا چہرہ

●

عجیب بات ہے اکثر تلاش کرتا ہے
وہ بے وفائی کا پہلو مری وفاؤں میں

●

وہ آکے تیرے شہر سے جا بھی چکا مگر
چشمِ امیدوار ترے ساتھ کون تھا

●

آنکھ بھر آئی کہ یادوں کی دھنک سی بکھری
ابر برسا ہے کہ کنگن کی کھنک سی بکھری

Scanned with CamScanner

دشتِ آواز میں گونجی مری شرمیلی ہنسی
ترے لہجے کی ہواؤں میں کھنک سی بکھری

●

اسے تو مجھ سے بچھڑ کر بھی مل گئی منزل
میں فاصلوں کی طرح کھو گئی فضاؤں میں

●

کوئی خوشبو تھی لہجے کی تھکن میں
کہ رنگِ لب تھا چشمِ نیم وا پر

●

ہر چند مثل سایۂ دیوار و در ہے وہ
ہم سے خفا زمانے سے، شوریدہ سر ہے وہ

●

ان اشعار کے مطالعے سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آنے والی نسل نے ان رنگوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ بالخصوص پروین شاکر نے ان کی روایت کو نئی بلندیوں سے آشنا کرایا جو اس کی کرشمائی شہرت کا ایک بڑا سبب بن گئی۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعرات کے یہاں لوگ پروین شاکر کا رنگ تلاش کرنے لگتے ہیں لیکن ان کا دھیان اس طرف جاتا ہی نہیں کہ خود پروین کے یہاں کس کے رنگ کی جلوہ گری ہے؟

عشق کی دوسری جہت عرفانہ کی شدید وطن پرستی کے جذبات میں چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے جب ان کو اپنے ملک پاکستان کو خدا حافظ کہہ کر کناڈا کی شہریت اختیار کرنی پڑی۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں ہجرت کا بے کراں دکھ سمٹ آیا۔ یادِ وطن شاعرہ کی پلکوں پر شبنم کے شگوفے کھلاتی ہے۔ مٹی کی خوشبو، دریا کی روانی دیسی پھولوں کے رنگ غرض تمام اشیا سے بچھڑنے اور طویل فاصلوں کے حائل ہونے کا احساس ان کے اشعار میں درد کی عجیب کیفیت جگاتا ہے۔ دیارِ غیر میں وطن کی

Scanned with CamScanner

یادیں ٹھنڈی، گھنی چھاؤں بن جاتی ہیں۔اور یوں شعر کے سراپے میں ڈھل جاتی ہیں:

یاد ہے دیس کے دریاؤں کی موہوم صدا
اور یہ آنکھ وہ چشمہ کہ ابلتا ہی نہیں

●

وطن کی یاد سرِ شامِ ہجر جب آئی
ابھرتا چاند بھی نوحہ کناں نظر آیا

●

نہیں ہے جس کے مقدر میں روشنی گھر کی
وہ کس کی راہ میں روشن چراغِ شام کرے

●

شبِ فراق میں ہے فرصتِ قرار کسے
کہ یاد آیا وطن اور چاند سا چہرہ

●

ہزار ترکِ وطن کا تھا مرحلہ درپیش
مری نظر میں رہا نیم وا کوئی در بھی

●

پھر جیسے ہوں دلوں کے تعاقب میں فاصلے
پھر دن برے ہماری دعاؤں پہ آئے ہیں

●

تری فرقت میں زندہ ہوں ابھی تک
بچھڑ کے تجھ سے تیرا آسرا ہوں

●

دیتا ہے آج کون سرِ رہ گزر صدا
یہ شہر آشنا ہے نہ آواز آشنا

Scanned with CamScanner

•

مری محرومیوں کا راز جیسے
سمندر کی ہواؤں سے کھلا ہے

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرفانہ کے دل میں وطن محبوب کی طرح بسا ہوا ہے اور ایسے میں قاری کے لیے دشوار ہو جاتا ہے کہ عشق کی اس شدت کو کیا نام دیں۔ عشق کی تیسری جہت آفاقی اور عالم گیر ہے۔ یہاں شاعرہ غمِ ذات کے ساتھ ساتھ تمام انسانوں کے دکھ درد میں شریک نظر آتی ہیں۔ جس کے سبب ان کی غزلوں کا افق وسعت اور ہمہ گیریت اختیار کر لیتا ہے ۔جس میں خوشیوں اور غموں سے بھری کائنات جلوہ گر ہے۔ عرفانہ نے سچے اور ایمان دار فن کار کی طرح اجتماعی سطح پر زندگی کے پیچیدہ مسائل کو پیش کیا ہے۔ جو ان کی حساس تخلیقی شخصیت اور فکری روے کی بہترین مثال ہیں:

•

شہرِ ویراں کی فضاؤں پہ نہ جاؤ لوگو
آج کل شخص کوئی گھر سے نکلتا ہی نہیں

•

ہر ایک کوچے میں سر کی ردائیں چاک ہوئیں
تہہِ نجوم ہے کیوں حسن سوگوار نہ پوچھ

•

اب کے وہ منصفوں سے نہ چاہے گا منصفی
ہر چند بے گناہ دریدہ جگر ہے وہ

•

یہ فصلِ گل عجیب ہے ہر نوکِ خار پر
لرزاں ہے موجِ رنگ بھی خوں ناب کی طرح

Scanned with CamScanner

صدائیں دے گا لہو دل کی دھڑکنوں کی طرح
رہا سکوت اگر بام و در پہ طاری بھی

●

کب دل کے زخم چارہ گروں سے لہو ہوئے
جو ہاتھ دل کی سمت بڑھے سب رفو ہوئے

●

پھر صدا دے رہی ہیں زنجیریں
پھر کوئی امتحاں ہے دیکھو تو

●

حریفِ سنگ سہی کارگاہِ شیشہ گری
بکھر گیا ہے تو کون و مکاں دوبارہ دیکھ

●

شجر محرومیوں کے رنگ لائے
ہوئے جب زخم تازہ پھر ہوا سے

●

جو لوگ روایات کی ہیبت سے تھے خاموش
اب ان کے لبوں پر بھی سوال آنے لگا ہے

●

کفِ بہار پہ کیا کم ہے آدمی کا لہو
کہ نخلِ دار پہ آئے گلوں کا موسم پھر

●

سراغِ نقشِ قدم مٹ گئے تو کیا غم ہے
کہ منزلوں کے تعاقب میں رہ گزار تو ہے

Scanned with CamScanner

پکارتا ہے مجھے بے گنہ لہو کس کا
مہک ہے کس کے لبوں کی مری صداؤں میں

●

قفس میں درد کے مارو یہی غنیمت ہے
نسیمِ صبح فسانہ گلوں کا کہتی ہے

یہ ہنرمندی ان کی وسیع المشربی، دردمندانہ شخصیت اور بے کراں تخیل کی دین ہے۔ وجود کی قوت کا احساس نہ صرف انہیں حوصلہ دیتا ہے بلکہ ان کی فکر کو بھی ہمہ گیریت بخشتا ہے۔ ان کی جمالیاتی شخصیت اپنی جہت میں آفاقیت سمیٹ لیتی ہے۔ انھوں نے تجرباتِ زندگی کو لطیف رمزیت وایمائیت کی آمیزش سے اجتماعی حسیت سے شیروشکر کردیا ہے۔ ان کی شاعرانہ بصیرت وجود کے اندر فروزاں قوت اور حوصلے کے چراغوں کی لو کو بادِ مخالف کے سامنے بھی روشن کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ اعتماد و یقین کا جذبہ اشعار میں طلسم کا فسوں بھر دیتا ہے۔ جو ایک اہم وصف کی صورت ان کے غنائی اسلوب میں اپنے جلوے دکھاتا ہے۔ احساس کی نیرنگی ایک طرف لفظوں کے دلکش پیکر تراش لیتی ہے تو دوسری جانب مترنم آہنگ قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ تراکیب کا حسن، خیال کی تازہ کاری اور اظہار کی ندرت ان کی شاعری کے اہم وصف ہیں۔ مظاہر فطرت کا حسن شاعرہ کے جذبہ وفکر سے ہم آہنگ ہو کر بڑے خواب ناک اور دلربا پیکر تراش لیتا ہے۔ یہ بلیغ شعری پیکر تنوع، جاذبیت اور رعنائی سے بھرپور ہیں۔ 'برگِ ریز' کے آخر میں شامل ان کی سات غزلیں ہندی لب و لہجے کی خوب صورت مثال ہیں:

سورج کی گرمی سے مہکے چندن جیسا روپ
کومل ہات سے چنتی جائے سندر نار کپاس

●

جیسے کوئی چنچل جھرنا گونجے بن کے بیچ
یاد ہے اب تک مجھ کو اس کے لہجے کا سنگیت

Scanned with CamScanner

●

من کا دیپ جلا کر ہم نے دیکھا اس کا روپ
صبح کے نور میں ڈھالی ہم نے دکھ کی کالی رات

●

خون پسینے سے ہاری نے درد کے سینچے کھیت
دمک رہا ہے ہیروں جیسا سپنوں کا کھلیان

●

روپ کے پاؤں چومنے والے سن لے میری بانی
پھول کی ڈال بہت ہی اونچی تو ہے بہتا پانی
آس کے ریشم سے مایا کے بن کر جال روپہلے
چاند سناتا ہے ندیا کو اپنی پریم کہانی

●

بچھڑا ساتھی ڈھونڈ رہی ہے کونجوں کی اک ڈار
بھیگے بھیگے نین اٹھائے دیکھ رہی ہے شام

●

کوئل بن کر کھوج رہا ہے اپنی کھوئی پریت
کلیوں کے آنچل مہکاتا ساون کا سنگیت

●

ہاتھ لگاؤ تو انگارے دیکھو تو ہیں پھول
من کو دکھائے آس کا درپن کیسے کیسے رنگ

●

مظاہر فطرت کی مدد سے جذبوں کو زبان دینے کا یہ عمل بہت دل نشین ہے۔ عرفانہ نے

Scanned with CamScanner

گویا لطیف اور نازک احساسات کو مصور کر دیا ہے۔ رنگوں کی ست رنگی قاشیں شعر کے پیکر میں ڈھل گئیں ہیں۔ یہ ان کی ہنرمندی کا کمال ہے جو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ ہندی رنگ و آہنگ کی ایسی مثالیں "کفِ بہار" میں نہیں بلکہ وہاں فارسی تراکیب و تلازمات کے بے ساختہ استعمال نے غزلوں کا حسن دو آتشہ بنا دیا ہے۔ خوب صورت اور دلاویز پیکروں سے بھرپور یہ اشعار جمالیاتی مسرت سے آشنا کراتے ہیں:

کس قدر ہوش ربا ہے موسم
رقص زنجیر صبا کرتی ہے

●

تلاشِ دید میں ہر راستہ چراغ بہ کف
پکارتی ہے کسے چشمِ انتظار نہ پوچھ

●

ہر ایک دجلۂ خوں میں ہے موج زن خورشید
فضائے دہر رمِ زندگی سے کہتی ہے
نگارِ گل پہ سبھی زخم دل کے وارے گئے
بہار آئی تو زلف و قبا سنوارے گئے

●

نظر وہ آئے تو یہ چشمِ اشک بار مری
شعاعِ خوں سے چراغوں کا اہتمام کرے

●

میں دشتِ ذات میں اتری تو تہہ بہ تہہ خوشبو
مثالِ رنگ اڑی درد کی ہواؤں میں

Scanned with CamScanner

میں حرفِ دل نواز کو سمجھوں نویدِ گل
میں کلمۂ حبیب کو دستِ صبا کہوں

●

لیے پھری ہے ہمیں ساتھ ساتھ مشکِ صبا
لباسِ گل میں وہ چہرہ جہاں نظر آیا

عرفانہ عزیز کی غزلوں کا ایک اہم وصف ان کی غنائیت ہے۔ جہاں احساس کی نیرنگیاں لفظوں میں مجسم ہو جاتی ہیں ہیں اور مترنم آہنگ قاری کے دل میں اتر تا محسوس ہوتا ہے۔ خیال کی تازہ کاری، تراکیب کا حسن اور اظہار کی ندرت شاعرہ کی جمالیاتی حسیت کے نمائندہ عناصر ہیں۔ شدید جذبات و کیفیات اور لطیف احساسات کو نسوانی فطرت کی نرمی اور فن کارانہ ہنر مندی کے ساتھ پیش کرنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ کلاسیکی شعور کا گہرا رچاؤ، جذبوں کی وارفتگی اور خواب ناک لہجے کی نغمگی کا توازن ان کی غزلوں کے کینوس کو دھنک رنگ بنا دیتا ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

ناہید اختر

ناہید پروین ۱۹۴۲ء میں رانچی (جھارکھنڈ) میں تولد ہوئیں۔ان کے والد عنایت الرحمٰن عنایت ڈسٹرکٹ جج ہونے کے ساتھ ہی ایک اچھے شاعر بھی تھے۔جنہیں نوح ناروی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔والدہ ذکیہ رحمانی شفیق ماں اور بہترین بیوی ہونے کے ساتھ قرآن پاک کی خوش گلو قاریہ بھی تھیں۔ان کی بڑی بہن بلقیس ظفیر الحسن ایک نامور شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ بابائے جمالیات پروفیسر شکیل الرحمٰن ان کے چچا ہیں۔اسی علمی،ادبی اور تہذیبی پس منظر میں ناہید کی پرورش ہوئی۔شاعری کے علاوہ وہ افسانے بھی لکھا کرتی تھیں۔ان کی شادی بھاگل پور کے ایک معروف علمی اور باوقار گھرانے میں مہدی اختر شکیل سے ہوئی تھی۔گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ان کو مطالعے سے بھی گہرا شغف تھا۔ملک کے بیش تر رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ۷/دسمبر ۲۰۰۸ء میں بھاگل پور میں ان کا انتقال ہوا۔ ۲۰۰۹ء میں ان کا شعری مجموعہ 'جراحتوں کے پھول' ان کے شوہر اور بچوں کی کوشش سے شائع ہوا۔

شاعری میں غزل اور نظم دونوں ہی اصناف ان کی تخلیقی شعور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نظموں میں فکر و خیال کے افق زیادہ روشن اور تابناک ہیں مگر غزلوں میں بھی تخلیقی نمو اور حرارت کم نہیں۔جذبہ واحساس کی شدت اور گہرائی نے طرزِ اظہار کا فطری حسن اور روایت و جدت کا خوش گوار امتزاج پیدا کر دیا ہے۔جوان کی غزلوں کا نمایاں وصف ہے۔ماحول میں رائج خود غرضی،نفرت،بے گانگی،رشتوں اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت ان کی فکر کے اہم زاوئے ہیں جنہیں وہ اپنے سادہ انداز میں شعر میں سمو دیتی ہیں:

Scanned with CamScanner

نہ لوگ بدلے نہ لوگوں کے ذہن بدلے ہیں
جراحتوں کا سفر آج بھی مسلسل ہے

●

حسب نسب کسے کہتے ہیں ہے سیادت کیا
زمانہ زر کا ہے اس دور میں شرافت کیا
دیارِ غیر میں کیا پوچھتے ہو نام و نشاں
غریبِ شہر ہوں میں کیا مری نجابت کا

●

ہر اک تلاش کا حاصل تو بس یہی نکلا
کہ جس کو ڈھونڈا وہی شخص اجنبی نکلا

●

شہر بے مہر ہے کیا پیار کی رت ٹھیرے گی
بے ریا دل لئے کیا ڈھونڈنے آئے ہو یہاں

●

ناہید اختر کی حساس طبیعت کے لیے بھاگل پور کا فساد ایک تازیانہ تھا۔ ان کی دردمندی نے کئی نظموں کو جنم دیا۔ غزلوں کے اشعار میں بھی اس کرب کی صورت نمایاں ہے:

خزاں بدوش صبا پھر رہی ہے آوارہ
میں کس سے پوچھوں مرا لالہ فام کیسا ہے

●

ہر شہر ہوا ہے شعلہ فشاں ہر سمت دھواں گھنگھور دھواں
جھلسے جھلسائے چہروں میں پہچان کسی کی پائیں کیا

●

پروں سے پیٹتی سر کو گئی ہے کیوں بلبل
الٰہی میرے چمن کی تو آبرو رکھیو

Scanned with CamScanner

●

روز جھٹکوں پہ جھٹکے لگتے ہیں
زلزلہ ہو گئی ہے میری ذات
زندگی ! اب ترا خدا حافظ
ہے اجل پشت پر لگائے گھات

●

حشر کیسا ہوا بپا لکھوں ؟
شہر کا اپنے مرثیہ لکھوں ؟
جن کے لمحے صدی سے لمبے تھے
ایسی راتوں کا تذکرہ لکھوں ؟

ناہید اختر مکمل خاتونِ خانہ تھیں۔ باہری دنیا سے ان کی وابستگی کا دائرہ اخباروں اور رسائل تک ہی تھا۔ روزمرہ کی خانگی ذمہ داریوں سے نپٹ لینے کے بعد ادبی کتابوں کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ افسانہ اور شاعری کے علاقے ان کے اندر کے حبس کو کم کرنے کا بہترین ذریعہ تھے۔ ان کی غزلوں میں روایتی موضوع کے ساتھ ساتھ نسائی کیفیت کا اظہار بھی سادگی، شائستگی اور وقار کے ساتھ ہوا ہے جو ان کی شخصیت کا زائیدہ ہے۔ وہ خود سراپا محبت تھیں اس لئے ان کے جذبہ و خیال بھی لطافت اور نرمی میں گندھے ہوئے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے تو بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا:

وفا میں کون ہے میرا مقابل
جفا میں کون ہے تیرا مقابل
بہارِ صحبتِ یاراں تو گزری
اور اب ہے یاد کا صحرا مقابل

●

Scanned with CamScanner

مدت گزری اک حرفِ طلب ہونٹوں پر آ کے ٹھیر گیا
تم سن نہ سکے ہم کہہ نہ سکے، اس بات کو اب دہرائیں کیا

●

کیسے بن جاتے ہیں لمحے صدیاں
تم ہوئے دور تو جانا جاناں

اب کچھ ان کے نسائی خیالات ور جحانات پر نظر ڈالیں۔فن پارہ اپنے فنکار کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے۔اس اعتبار سے ناہید کی غزلوں میں بھی اندر کی گھٹن کے ساتھ دل گرفتگی ملتی ہے کہ ان نظر میں عورتوں کی حالتِ زار کا سبب اس کے محافظ لوگ ہی ہیں جو مساوات مخالف اصولوں کو اپنی آن ،بان اور شان کے لیے صدیوں سے ڈھوتے چلے آ رہے ہیں۔جو غلط رسم ورواج کے بندھن میں جکڑی عورتوں کے سوچ اور فکر کو پنپنے بھی نہیں دیتے بلکہ اپنی مرضی کے تابع رکھتے آئے ہیں۔اس کے باوجود تخلیقی نسائی وجود اپنے روشن شعور اور جمالیاتی آگہی کے ساتھ احتجاجی روئے کا اظہار کر ہی دیتا ہے۔حرفِ طلب جب لبوں سے ادا نہیں ہو پائے تو بے حاصلی اور نا آسودگی کی کسک ٹیس بن جاتی ہے۔وجود کی ناقدری کا احساس درد بن کر تخلیق میں گھل جاتا ہے۔ناہید نے اپنے معاشرے کی ایسی سچائیوں کو ضبط اور شائستگی کے ساتھ اشعار میں سمیٹا ہے۔

ہم کہ خود ساختہ زنجیروں کے دیرینہ اسیر
درِ زنداں بھی کھلا پائیں تو جائیں گے کہاں

●

ہوا ہے قتل مرا وارثوں کے ہاتھوں سے
کرے گا کون طلب کس سے خوں بہا میرا

●

ایک ٹہنی نہیں یہاں اپنی
آشیانے کی بات کرتے ہو

Scanned with CamScanner

جل رہا ہے بجھ بجھ کے جانے کتنی صدیوں سے
شام کے دھندلکے میں اک چراغِ دل تنہا

•

دل میں جو ہے وہی زباں پر
آئینہ کی طرح کھری ہوں
خیر انا کے صنم کدوں کی
ضد پہ میں بھی اڑی ہوئی ہوں

•

کھلی جو آنکھ تو پتجھڑ کا راج تھا ہر سو
مجھے پکار کے ساون چلا گیا شاید

•

میں دشمنوں کی شکایت کا حق نہیں رکھتی
کہ دوستوں ہی نے کب پیار کا بھرم رکھا
یہ سرکشی، یہ بغاوت مرا سرشت نہ تھی
بہت ستایا جہاں نے تو میں نے منھ کھولا

•

کاش کہ بس میں مقدر ہوتا
پھر تو ہر شخص سکندر ہوتا

ان اشعار میں نسائی کرب کی زیریں لہریں ہیں جن کی سبک گامی سوچ کے دریچے کھولتی ہے۔ مہذب اور مدھم لہجے میں کہی گئی بات کا الگ رمز ہے۔ 'ٹہنی' کی علامت اختیار کی لاچاری کا مظہر ہے۔ جبر کی حد تو یہ ہے کہ عورت کا ایک آشیانہ ہونا تو دور ایک ٹہنی جیسی ننھی چیز بھی اس کے

Scanned with CamScanner

اختیار سے پرے ہے۔اور جب شعور کی آنکھیں کھلتی ہیں تو ہرے موسم کے دن بیت چکے ہوتے ہیں۔اسیری سے نباہ مجبوری بھی ہے کہ درِ زنداں کھل بھی جائے تو جائے اماں کہیں نہیں کہ قتل کرنے والے ہاتھ بھی وارثوں کے ہوتے ہیں۔ناہید اختر نے کم غزلیں کہیں اس کے باوجود فکری شعور و آگہی اور سادہ مگر پراثر زبان کے باعث ان کا یہ تخلیقی سرمایہ گراں قدر اہمیت کا حامل ہے

●●

Scanned with CamScanner

رفیعہ شبنم عابدی

بیسویں صدی میں جب شاعرات اپنے خیال وفکر کے اظہار کے لئے سوادِ شاعری میں خیمہ زن ہوئیں تو نسائی جذبات واحساسات پر مشتمل نئی تصویریں مختلف کیف واثر کے ساتھ وجود میں آنے لگیں۔ شاعری جو تخلیقی شخصیت کے باطنی انکشاف کا منظرنامہ ہے، شاعرات کے لیے تو بالخصوص کڑی آزمائش ہی ثابت ہوئی کہ نسوانی ذات کا عکس بھی جھلکے اور رسمِ پردہ داری پر بھی آنچ نہ آئے۔ تو اس طرح 'بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی' والا معاملہ شاعرات کو درپیش رہا۔ پچھلی صدی کے نصف آخر میں نسائی جذبات واحساسات کو ضبط، سلیقے، رکھ رکھاؤ اور سربلندی کے ساتھ پیش کرنے میں رفیعہ شبنم عابدی ممتاز اہمیت کی حامل ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی اردو اور فارسی شعبے کی ہشت پہلو تدریسی شخصیت کا نام ہے۔ وہ ایک کامیاب شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی ناقد اور ترجمہ نگار بھی ہیں۔ حافظؔ کی غزلوں کا ترجمہ ''شاخِ نبات'' کی صورت میں اور مراٹھی نظموں کا ترجمہ ''دھنک'' کے روپ میں شائع ہو چکا ہے۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے ''نظر نظر کے چراغ'' اور ''نظر ونقطۂ نظر'' کے نام سے مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیقی مقالے ''اردو شاعری پر اسلامی اثرات'' ''اردو شاعری میں شیعی اثرات'' اور ''ملا وجہی بہ حیثیت انشا پرداز'' بھی اشاعتی مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ تدریسی مضامین پر مشتمل ایک کتاب ''تدریسی نکات'' بھی ان کی علمی کاوشوں کی گواہ ہے۔ فکشن کے میدان میں افسانوں کا مجموعہ ''سپنے جاگے'' اور دو ناول ''میں پاگل، مرا منوا پاگل'' اور ''دل ٹوٹے نا'' کے نام سے ان کے علمی، ادبی اور تخلیقی بصیرت کے نمائندہ ہیں۔ اردو ادب میں ان کی یہ علمی اور تخلیقی کاوشیں ان کے شعور ووجدان کے جمالیاتی روئے کا اظہار ہیں۔

Scanned with CamScanner

شبنم کی شعری کائنات چار مجموعوں پر مشتمل ہے۔ پہلا ''موسم بھیگی آنکھوں کا'' (۱۹۸۵) دوسرا ''اگلی رت کے آنے تک'' (۱۹۹۴) تیسرا ''آنگن آنگن پروائی'' (۲۰۰۹) اور چوتھا ''نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں'' (۲۰۱۰) میں شائع ہوا۔ جن کے مطالعے سے غزل اور نظم دونوں شعری اصناف پر ان کی ہنرمندانہ گرفت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غزل جو رمز و ایمائیت اور اختصار کی متقاضی صنف ہے، شبنم کے یہاں قیمتی تاریخی وراثت اور جمالیاتی تہذیب کا منظر نامہ بن گئی ہے ۔ وہیں نظم جو بیانیہ صنفِ سخن ہے شاعرہ کی تخلیقی شخصیت کے فطری رکھ رکھاو، سلیقہ مندی اور حساسیت کی دلکش تصویر سی نظر آتی ہے۔

رفیعہ شبنم کی غزلوں میں نسائی وجود اپنے خیال و فکر کی نیرنگیوں کے ساتھ نہایت متوازن انداز میں پیش ہوا ہے۔ یہ کسی نوعمر لڑکی کی نفسیات یا محض رسیلے جذبات نہیں بلکہ ایک ذمہ دار، خوددار اور باشعور عورت کے احساسات و تفکرات ہیں۔ جس کے یہاں گھر آنگن میں پھیلی بکھری الجھنیں بھی ہیں اور باہری دنیا کے کرب ناک مسائل بھی۔ اس اعتبار سے ان کی غزلوں کا افق وسیع اور دھنک رنگ ہے۔ ان کے اشعار میں عورت کی انا، وفا اور عظمت کے ساتھ ساتھ فطری حیا، خوف ، الجھن اور کشمکش کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں ٹوٹنے بکھرنے کا عمل بھی ہے اور خود کو سمیٹنے اور سر بلند رکھنے کا حوصلہ بھی۔ جرأتِ فکر کی چند مثالیں دیکھیے :

●

شہر میں ، دشت میں ، گلزار میں کب جاتی ہے
میری آواز مرے گھر میں ہی ، دب جاتی ہے

●

میری ہر سانس میں شامل تھی تمہاری مرضی
حرفِ اثبات مرا، اپنی رضا ہی کب تھا

●

اسے یہ ضد تھی کہ ہر سانس اس کی خاطر ہو
مگر مجھے تو زمانے کے ساتھ جینا تھا

Scanned with CamScanner

مری آنکھوں پہ پہرے ہیں ہزاروں
مگر یہ سوچ تو اندھی نہیں ہے

●

رفیعہ شبنم کے یہاں نسائی کرب و درد کا اظہار دراصل اس تاریخی اور تہذیبی جبر کا زائیدہ ہے جسے رسم و رواج اور مذہب کے ریشمی گھونگھٹ میں ٹانک، سجا کر عورتوں کا مقدر بنایا جاتا رہا ہے ۔نسائی وجود اور اس کے جذبوں کا استحصال صدیوں سے مرد اساس معاشرے کی فطرت بنی ہوئی ہے۔اس کی پامالی اور زبوں حالی کی یہی روایتی قتل گاہ ہے۔ جسے کبھی خاندانی اور تہذیبی روایت کی دہائی دے کر اور کبھی شرعی دائرے کی موٹی موٹی لکیریں دکھا کر آباد رکھا جاتا رہا ہے۔مگر بیسویں صدی میں جب کہنہ روایتوں کی زنجیروں کو توڑنے اور بوسیدہ رواجوں سے آزاد ہونے کا عمل شروع ہوا تو اس مجبور اور محبوس قوم کے زنداں میں بھی در کھلنے لگے۔پھر نہ صرف صدیوں کا حبس باہر آیا بلکہ تازہ ہواؤں نے بھی شکستہ جسم و جاں میں ایک تازگی سی بھر دی۔شبنم کے اشعار میں نسائی دکھ اور احتجاج کے خوب صورت رنگ ملتے ہیں:

●

ہزار صدیوں سے دیوار و در میں قید ہوں میں
ذرا سی دیر پروں کو مری اڑان تو دے

●

بغاوتوں کو کچلنا ہی فرض ٹھہرا تو
امیرِ شہر مرے گھر سے ابتدا کرنا

●

مرضی سے اپنی بس یوں ہی دو سانس لے لیے
تھوڑا سا حوصلہ تھا کوئی سرکشی نہ تھی

●

Scanned with CamScanner

اسیر ہو ہی گئیں تہمتوں کے جنگل میں
کہیں تو آ کے ٹھہرتیں بغاوتیں میری
نہ جانے کب کسی دیوار میں چنی جاؤں
ہیں انتظار میں کب سے جسارتیں میری

●

ہزاروں برس سے مجھے تم نے یوں ہی بنامِ تحفظ گرفتار رکھا
تمہاری طرح کیا مجھے آسمانوں میں پرواز کرنے کی حسرت نہیں تھی
روایت تو پھر اک روایت ہی ٹھہری اسے آخرش ٹوٹ جانا تھا اک دن
بغاوت مگر اس سے پہلے یہ مانا کہ میرے قبیلے کی عادت نہیں تھی

●

ان اشعار میں ان تمام عورتوں کا درد چھلک رہا ہے جو صدیوں سے پدری سماج کی اونچی فصیلوں کے اندر بنے زنداں میں تحفظ کے نام پر مقید ہیں۔ جنہیں نہ مٹھی بھر آسمان ہی حاصل ہے اور نہ تازہ ہواؤں کا لمس۔ ایسے میں اپنی مرضی سے دو سانس بھی لینا سرکشی اور بغاوت میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ رفیعہ شبنم کی فکر جب ذات کے نہاں خانوں سے کائنات کی طرف جست بھرتی ہے تو ایسے دل دریدہ منظروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ پھر آگہی کے در کھلتے ہیں اور خیال و فکر کا لاوا شاعری کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ ایسے میں ان کا لہجہ بھی طنز کی کاٹ سے بھر جاتا ہے۔ جو ان کی احتجاجی فکر کو وہ دھار دیتا ہے جس سے وہ صدیوں سے زنجیروں میں جکڑے ہوئے آدھی آبادی کے وجود کو آزاد کرا سکیں۔ وہ عورت کی فطری کمزوری یا بزدلی پر پشیماں نہیں بلکہ مردوں کے بلند دعووں پر نشانہ سادھتی ہیں۔ سلیقے سے کئے گئے وار ان کی شاعرانہ ہنرمندی کا آئینہ ہیں:

وہ تو بزدل تھی ترے ساتھ نہ آنے پائی
تو جری تھا تو اسے کس لیے اغوا نہ کیا

●

Scanned with CamScanner

اس لیے چوڑی بھرے ہاتھوں نے تیغیں تھام لیں
بزدلوں کے شہر میں مردِ جری کوئی نہ تھا

●

ترے جنون کا اس وقت بھی علاج نہ تھا
مرے قبیلے میں پردہ کا جب رواج نہ تھا

●

شبنم عورتوں کے وقار اور احترام کی آرزومند ہیں۔ اس کا وہ مقام جو نہ صرف مذہبی کتا بوں میں درج ہے بلکہ عہدِ قدیم کی تاریخ اور تہذیب کا حوالہ بھی ہے۔ جسے صدیوں مرد اساس معا شرے نے جان بوجھ کر ان دیکھا کیا اور آج بھی اس سچائی سے پہلوتہی کی جا رہی ہے۔ شاعرہ اسی نا برابری اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ آنکھوں پر ہزاروں پہرے لگے ہونے کے باوجود اپنی روشن سوچوں سے سوادِ غزل کو جگمگانے میں مصروف رہی ہیں:

●

یہ کیسی آگ ہے جو پور پور روشن ہے
یہ کس نے رکھ دی مری انگلیوں میں مشعل پھر

●

اسی مشعل کی روشنی میں شبنم نے ایک باشعور عورت کی نظروں سے دنیا کا جائزہ لیا ہے۔ سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اپنے ان تجربات و مشاہدات کو انہوں نے بہ خوبی شعر کا پیکر عطا کیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول کا منظر نامہ دو عالمی جنگوں کی ہولناکیوں کے سبب خاک اور خون سے شرابور تھا۔ اور اس کے بعد ملک کی تباہ کن تقسیم، جس کے نتیجے میں فسادات کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ جو ہنوز جاری ہے۔ جس کا خمیازہ ہمیشہ عورتوں کو اغوا، آبروریزی اور بیوگی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ سامراجی قوتوں کا جبر اور مجبور قوموں کا استحصال صدیوں سے دنیا کا مقدر رہا ہے۔ خیر اور شر کی

Scanned with CamScanner

جنگ میں اخلاقی قدروں کا زوال اور انسانی جانوں کا زیاں آج بھی دنیا کی تباہی کا باعث ہے۔ مکرو فریب کی ندیاں رخ بدل بدل کر نت نئی بستیوں کو تاراج کر رہی ہیں۔ خوف اور دہشت کا آسیب مظلوم انسانوں کو اپنے پنجے میں جکڑے ہوئے ہے۔ ایسے ماحول میں حساس فنکار اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ماضی کے اوراق پلٹ کر اساطیری اور تلمیحی علامتوں کی بازیافت کرتا ہے تاکہ اس کی فکری جہت روشن ہو۔ رفیعہ شبنم عابدی کی شاعری میں بھی اساطیری اور مذہبی تلمیحات بکھری ہوئی ہیں۔ بالخصوص عہدِ جبر کی عکاسی کے لیے کربلا اور اس سے جڑے کردار و واقعات کو انہوں نے بڑی ہنرمندی سے اپنے تجربات و مشاہدات سے آمیز کر دیا ہے:

●

نیزوں میں گھری جاتی ہے فریادِ العطش
کوزہ بدست نکلے ہیں پیاسوں کی خیر ہو
شبنم یزیدِ وقت کو درکار ہے لہو
سچائیوں کے چاہنے والوں کی خیر ہو

●

ہزار قرض نکلتے ہیں تجھ پہ موجِ فرات
مرے قبیلے کی پیاسی سپاہ کے اب تک

●

یہ شام کا بازار ہے یا کرب و بلا ہے
ہر خواب مرا وقت کے نیزے پہ چڑھا ہے

●

ہمارے جسم پہ زخموں کے پھول کیوں نہ کھلیں
کہ یہ بنا ہی ہوا خاکِ کربلا کا ہے

●

Scanned with CamScanner

سنا ہے ریگ مزاجوں کی حکم رانی ہے
یہ طئے ہوا ہے کہ پیاسوں کو قتل ہونا ہے

●

وہی ہے خنجر قاتل، وہی ہے خون کی پیاس
مگر تھکی نہیں تا ریخ ا نقلا بو ں سے

●

ان اشعار میں ایک عورت کی آنکھ سے دیکھی اور تجربوں کی بنیاد پر پرکھی ہوئی دنیا کے حالات کا کرب ہے۔ منافق ذہنوں کی حکم رانی، اس کے مکروفریب، تشدد پسندی، جارحیت اور ہوس ناکی کے خلاف ایک شاعرہ کی احتجاجی آواز ہے، جو عہدِ موجودہ کو تاریخ کربلا سے منسلک کر کے دیکھ رہی ہے۔ مظلوموں کی بے بسی اور بالغ نظروں کی خاموشی ان لفظوں میں ڈھل گئی ہے:

لرزتے کانپتے پتوں کی بے بسی مت پوچھ
عجیب خوف سا چاروں طرف ہوا کا ہے

●

یہ جرأتیں بھی اب کہاں کہ ساحلوں کو چھوڑ دیں
وہ لوگ کیسے لوگ تھے جو کشتیاں جلا گئے

کربلا کے علاوہ بھی شبنم کی شاعری میں مختلف اسطوری اور مذہبی علامات اپنی بھرپور معنویت کے ساتھ موجود ہیں۔ جو شاعرہ کی وسیع النظری اور ادبی وتہذیبی وراثت سے آگہی کا پتا دیتے ہیں۔ مثلاً ایسے اشعار:

میں سوہنی تو نہ تھی پھر بھی کیسے ڈوب گئی
کوئی گھڑا تھا نہ دریا کو پار کرنا تھا

●

آ تا مری تلاش میں اک شہہ سوار کیوں
میں کوئی شاہزادی نہیں تھی، پری نہ تھی

Scanned with CamScanner

میں بھی رادھا سے کوئی کم تو نہیں ہوں شبنم
سانولے رنگ کا میرا بھی تو گردھاری ہے

●

تم کوئی رام نہیں، میں بھی نہیں ہوں سیتا
پھر یہ بن باس اٹھانے کی ضرورت کیسی
میں بھی شبنم ہوں فقط کوئی زلیخا تو نہیں
تو بھی یوسف تو نہیں ہے کہ خریدوں تجھ کو

●

ظلم پہلے سے بھی شدید ہوا
کوئی راون کوئی یزید ہوا

●

شہزادی جب نیند سے جا گی
شیش محل افسا نہ تھا
شاہزادہ مری گرگابی اٹھائے کیوں کر
وہ اترنے کو ہی تیار نہیں مرکب سے

●

بہشت لے کے زمینوں کی حکم رانی دی
ملی خطا کے نتیجے میں یہ سزا بھی عجب

●

وہ ایک مٹی جو مشت بھر تھی، عجیب تخلیق تھی کہ جس میں
انائے ابلیس بھی نہاں تھی، اطاعتِ جبرئیل بھی تھی

رفیعہ شبنم کی شاعری کا ایک پیارا وصف تضاد کا حسن ہے۔ ان کا تخلیقی شعور دو متضاد لفظوں کے درمیان دلکش رابطے تلاش کر لیتا ہے۔ خیال و فکر کی ہم آہنگی جب اشعار میں ڈھلتی ہے تو اس کا حسن دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ ایسے پر کیف اشعار کے چند نمونے دیکھیے:

Scanned with CamScanner

وہ دھوپ کون سے آنگن میں جا کے ڈوب گئی
کہ جس کا روز تری چھت پہ آنا جانا تھا

●

ہم اپنے گاؤں میں تو شگفتہ تھے پھول سے
شبنم جو شہر آئے تو بس خاک ہو گئے

●

شہر کا یہ شور وغل وحشتوں کا ضامن ہے
اس سے خوب صورت ہے جنگلوں کا سناٹا

●

اک عمر بیتی مگر آج تک گئے ہی نہیں
ترے غضب کے مرے ضبط کے کمال کے دن
صبح تک دیکھی تھی سورج کے لبوں پر اک ہنسی
شام تک شبنم کی پلکوں پر نمی ٹھہری رہی

●

آدم کی تمنا ہوں، تماشہ تو نہیں ہوں
ابلیس کا بہکا ہوا سجدہ تو نہیں ہوں

●

ایک سرخی تری جلتی ہوئی آنکھوں میں بسی
اک سیاہی مرے بھیگے ہوئے کاجل میں رہی

●

ندی خجل تھی کہ بھیگی ہوئی تھی پانی میں
مگر پہاڑ کے ماتھے پہ کیوں پسینہ تھا

Scanned with CamScanner

●

بھلا ہوا کہ وہ اک شخص بے نقاب ہوا
پہاڑ جس کو میں سمجھی تھی وہ تو رائی تھا

●

مرداساس معاشرے میں صنفی صفات کے سبب عورت کم تر درجے کی چیز سمجھی جاتی رہی ہے۔ جب کہ یہ تفریق عین فطری ہے کوئی عیب نہیں۔ سماج اور معاشرے کی اسی نابرابری کے احساس کے سبب شبنم کا لہجہ احتجاجی ہو جاتا ہے جس میں طنز کی چبھن صاف جھلکتی ہے۔ کیوں کہ شاعرہ کو اپنے عورت پر غرور بھی ہے اور فخر بھی۔ وہ محض مرد کے تابع کوئی بے جان کھلونا نہیں بلکہ رنگا رنگ جذبات اور افکار کی حامل ایک زندہ مخلوق ہے۔ جو تاریخ اور عصرِ حاضر کے درمیان پھیلی ہوئی کائنات میں اپنے انفرادی وجود کی شناخت اور بقا کی خواہاں ہے۔ شبنم نے مرد کی بالا دستی پر قائم سماجی اور تہذیبی نظام واقدار میں عورت کے مسلسل ہوتے استحصال کو نہ صرف بے نقاب کیا ہے بلکہ ادائے منصفی پر بھی سوالات اٹھائے ہیں:

وہ بھیڑ تھی کہ ردا اپنی لٹ بھی سکتی تھی
خوشا کہ سامنے زنداں کا در دکھائی دیا
میں نعرہ زن تھی ترے ظلم کے خلاف مگر
ہزار شکر کہ لہجہ مرا نسائی تھا

●

وہ جس نے درسِ حق دیا بازارِ شام میں
شبنم وہ اپنے عہد کی یکتا خطیب تھی

شبنم کی غزلوں کے مطالعے سے بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کو کتنے بلند مقام پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ حضرت زینب ایک تاریخ ساز شخصیت ہیں جو نہ صرف بنتِ علی ہونے کے سبب لائق صد احترام ہیں بلکہ فرات کے کنارے میدانِ کربلا میں موجود حق اور باطل کے معرکہ کی

Scanned with CamScanner

چشم دید شاہد بھی رہی ہیں۔جن کے بیان کے حوالے سے ہی مورخوں نے تاریخ کربلا مرتب کی۔یہی درس حق دیتی ہوئی اور وقت کے ناپاک ہاتھوں سے خود کو بچاتی ہوئی عورت شاعرہ کی آئیڈیل ہے۔اس اعتبار سے عصرِ حاضر کی شاعرات میں رفیعہ شبنم عابدی منفرد اور نمایاں مقام رکھتی ہیں کہ انہوں نے سانحہء کربلا اور اس کے کردار کے حوالے سے اردو غزل کو ایک نیا ذائقہ دیا۔اپنی مذہبی تاریخ وتہذیب ،اردو کی طویل شعری روایت اور عہدِ جدید کے منظر نامہ کی آگہی سے ان کے شاعرانہ وجدان اور لسانی آہنگ کی تشکیل ہوئی ہے۔ان کی شاعری خالص نسائی دیدہ وری کا نمونہ ہے۔جس میں اناثی وجود کا کرب بھی ہے اور فکر کی جگمگاتی شمعوں کی قطاریں بھی جو زندگی کے تاریک اور نادیدہ گوشوں کو منور کرتی ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

وفاؔ لکھنوی

عزیز بانو داراب وفاؔ لکھنوی بیسویں صدی کے نصف آخر کی ممتاز اور منفرد شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری کی ابتدا ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹنے کے بعد لیکن جدیدیت کے خدوخال واضح ہونے سے قبل ہوئی۔ اس اعتبار سے وہ عبوری دور کی شاعرہ ہیں۔ موضوع اور اسلوب دونوں سطح پر ان کی شاعری جدت طرازی کا قابلِ تحسین نمونہ ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں انگریزی ادب میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم' اے کیا اور اسی شعبہ میں معلمی کے فرائض انجام دئے۔ لکھنوء کے تاریخی، تہذیبی، علمی اور ادبی ماحول نے ان کی شاعرانہ مزاج کی پرورش اور تربیت کی۔ بیسویں صدی سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر تغیرات اور انقلاب کی صدی رہی ہے۔ جس نے طبقۂ نسواں کو بھی سماجی، علمی تہذیبی اور ادبی سطح پر تبدیلیوں سے روشناس کیا۔ جس کے سبب عورتوں کو بھی معاشرے میں آزادانہ سانس لینے اور گھر کی کہنہ فصیلوں سے باہر نکل کر مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کے مواقع ملے بلکہ اپنی فکر و شعور کے بل پر زندگی کے اوجھل پہلوؤں کا جائزہ لینے کا بھی ادراک ہوا۔ وفاؔ کے یہاں بھی زندگی کے پیچیدہ مسائل، سماجی کشمکش اور طبقاتی نشیب و فراز شاعری کا موضوع بنتے ہیں۔ سچائی سے بھرپور تجربے، مشاہدے کی باریکی اور اظہارِ فکر کی نادرہ کاری ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد اور معاشرے کے وسیع تناظر میں پھیلی ہوئی زندگی کی تلخیوں اور کربناکیوں کی عکاس ہے۔ غزل کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی یہ رائے قابلِ غور ہے کہ:

> ''معیاری غزل کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کی روح سے ہم آہنگ ہونے کے سبب ایک نوع کی تازگی رکھتی ہو مگر اپنے زمانے کے حصار میں اس

Scanned with CamScanner

قدر محصور نہ ہو کہ آنے والا کل اسے پرانی بنا دے۔ کلاسیکی غزل سے اس کی وابستگی کسی نہ کسی حد تک ضروری ہے۔" مضامینِ نو،ص:۹۷

وفؔا لکھنوی کی غزلیں اس معیار پر کھری اترتی ہیں۔ آزادی کے بعد تہذیبی قدروں کی پامالی، فسادات کی خوں ریزی، استحصالی قوتوں کا آسیبی رقص اور معصوم، پُرامن خوابوں کی شکست یہ وہ سفاک حالات تھے جو شعر و ادب کے سلگتے ہوئے موضوعات بنے۔ وفا نے بھی ان موضوعات کو اپنی جمالیاتی فکر و احساس سے ہم آمیز کر کے پورے خلوص کے ساتھ غزل کے کینوس پر تصویر کر دیا ہے:

نہ کوئی جادہ نہ منزل مگر سفر میں ہوں
مثالِ موج سرابوں کے رہ گزر میں ہوں

●

کسی سراب کی زد میں ہر ایک ساحل ہے
میں جانتی ہوں کہ خود ریت کے بھنور میں ہوں

●

ہر ایک شہرِ نگار اس سمجھ رہا تھا مجھے
ذرا قریب سے دیکھو دھواں دھواں ہوں میں

●

بہا کے لے گیا سیلاب راستے جن کے
وہ شہر اپنے خیالوں میں اب بھی بستے ہیں

●

عصری آگہی کی بصیرت نے وفؔا کے اشعار میں بھی جدید شعراء کی مانند زندگی کی بے بسی، بے پناہی، تنہائی، خوف اور اداسی کے احساس کو نمایاں رکھا ہے۔ اپنے عہد کی حسیت کی تصویر کشی میں انہوں نے نئے نئے تلازمے وضع کئے ہیں جن کے سبب ان کے اشعار میں سر سبز تازگی کا

Scanned with CamScanner

ہماری بے بسی شہروں کی دیواروں پہ چپکی ہے
ہمیں ڈھونڈے گی کل دنیا پرانے اشتہاروں میں

●

عجیب لوگ ہیں کاغذ کی کشتیاں گھڑ کے
سمندروں کی بلا خیزیوں پہ ہنستے ہیں

●

وفاؔ کے اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک باشعور عورت کی نظر سے اپنے عہد کا جائزہ لیا ہے۔ جب کہ اپنی ابتدائی شاعری میں وہ بھی روایتی چلن کے مطابق اپنے لیے صیغہ تذکیر ہی استعمال کرتی تھیں۔ اس تبدیلی کا محرک کیا تھا؟ یہ تو پتا نہیں لیکن اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے آس پاس پاکستان سے آمد و رفت بڑھنے کے سبب وہاں کے شعری اور ادبی منظر نامہ سے بھی شناسائی ہوئی ہوگی۔ بھارت کی بہ نسبت پاکستانی شاعرات کے یہاں فکری جرأت مندی کی توانا مثالیں اداؔ جعفری، زہرہ نگاہ، کشور ناہیدؔ اور فہمیدہ ریاض کی صورت میں موجود تھیں۔ پھر پروینؔ شاکر کی 'خوشبو' نے تو صدیوں کی تذکیری روایت کے خلاف ایک نئے اور انوکھے طرز کی بنیاد ڈالی جس نے ہم عصر شاعرات کو یہ حوصلہ بخشا کہ وہ کھل کر اپنی ذات اور شخصیت کے حوالے سے اپنی شعری کائنات کی تعمیر کرنے لگیں۔ وفاؔ کے اشعار میں بھی نسائی رنگ و آہنگ کی آمیزش ہونے لگی:

وہ آسماں ہے مرا میں زمین اس کی ہوں
وہ مجھ پہ فصل اگائے یا کال دے مجھ کو

●

میں اپنے جسم میں رہتی ہوں اس تکلف سے
کہ جیسے اور کسی دوسرے کے گھر میں ہوں

●

Scanned with CamScanner

پھر سجا دے گا وہ یادوں کے عجائب گھر میں
سوچ کے عہدِ جنوں کا کوئی سکہ مجھ کو

●

میں چاہتی ہوں کہ پتھر میں ڈھال دے مجھ کو
وہ آئینہ ہے تو اپنی مثال دے مجھ کو

●

بٹھا کر اپنے سائے کرسیوں پر گول کمروں کی
کھسک جاتے ہیں چھپ کے چور دروازوں سے باہر ہم

●

کسی کو کیا خبر ہم اپنی پیدائش سے گونگے ہیں
ہماری زندگی کٹتی ہے اوروں کی زباں ہو کر

●

کریدتا ہے بہت راکھ میرے ماضی کی
میں چوک جاؤں تو وہ انگلیاں جلا لے گا

●

میں اس کی گرد ہٹاتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں
وہ آئینہ ہے مجھے خود شناس کر دے گا

درج بالا اشعار نسائیت کے انوکھے اور خوش نما رنگوں کی آمیزش کا دل آویز نمونہ ہیں۔نسائی ذات کی خوب صورت نمائندگی کے لیے 'زمین' کی علامت شاعرہ کی تاریخی، مذہبی اور تہذیبی قدروں کی آگہی اور جمالیاتی بصیرت کا مظہر ہے۔گول کمروں کی کرسیوں پر اپنی پرچھائیں بٹھا کر چور دروازوں سے کھسک جانے کی معصوم خواہش سماجی، معاشرتی اور تہذیبی جبر کی مخالفت کا اشاریہ ہے۔عورت کا موم کی گڑیا ہونا ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے۔وفا نے بھی نسوانی ذات کو

Scanned with CamScanner

پیدائشی گونگا درشایا ہے جس کی ساری زندگی مرد اساس معاشرے کی جی حضوری کرتے ختم ہو جاتی ہے۔ جس کی روح ایک گوشت پوست کے سراپے میں رہنے کے باوجود دوسروں کی مرضی کے تابع رہتی ہے اور پدری نظام کی جبریت سے باخبر ہونے کے سبب تمام عمر اپنی ذات کی نفی کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ ان سفاک سچائیوں کو پیش کرتے ہوئے شاعرہ کی آواز درد بھری چیخ نہیں بنتی بلکہ ان کی آواز اردو کی شعری روایت کی پاس دار اور تہذیبی قدروں کی خوب صورت مثال نظر آتی ہے جس میں مزاحمت کی ہلکی ہلکی لہریں اپنی موجودگی کا احساس کراتی ہیں۔ وفا کی شاعری عصری حسیت کی بھی پر اثر عکاسی کرتی ہے۔ دلکش تلازموں اور جاذب نظر پیکروں کے ذریعے اپنے عہد کی اجتماعی نا آسودگی، اجنبیت، بے گانگی، بے پناہی، احساسِ محرومی، اخلاقی اور تہذیبی زوال کو بھی انہوں نے پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ شعر میں سمو دیا ہے۔ زندگی کی مثبت قدروں پر ان کا یقین عصری مسائل کی پیچیدگی میں انہیں الجھاتا نہیں بلکہ فطری توانائی اور حوصلے کو نکھارتا ہے۔ جدید رنگ و آہنگ سے بھرپور ایسے اشعار باعثِ لطف و انبساط ہیں:

مآل کیا ہے اجالوں کے ان دفینوں کا
جنہیں چھوئیں تو اندھیروں کے ناگ ڈستے ہیں

●

ہمیں وہ ہیں جنہوں نے رات کی ہر شکل دیکھی ہے
سوادِ صبح تک کھمبوں پہ جلتی بتیاں بن کر

●

ہم ایسے پیڑ ہیں جو چھاؤں بانٹ کر اپنی
شدید دھوپ میں خود سائے کو ترستے ہیں

●

بہا کر لے گیا سڑکوں سے اک سیلاب سارے بت
ہمیں باقی بچے ہیں صرف اپنی یادگاروں میں

Scanned with CamScanner

ہم ایسے سورما ہیں لڑ کے جب حالات سے پلٹے
تو بڑھ کر زندگی نے پیش کیں بیساکھیاں ہم کو

●

مری بقا کے لیے لایئے چراغ کوئی
میں روشنی تو ہوں لیکن ابھی شرر میں ہوں
نہ پوچھ مجھ سے ابھی منزلِ سحر کا پتا
چراغِ راہ ہوں لیکن ابھی سفر میں ہوں

●

تھکن سے چور ہوں لیکن رواں دواں ہوں میں
نئی سحر کے چراغوں کا کارواں ہوں میں

●

بجھا کے رکھ گیا ہے کون مجھ کو طاقِ نسیاں
پر مجھے اندر سے پھونکے دے رہی ہے روشنی میری

●

یہی باطنی وجود کو پھونکتی روشنی شاعرہ کے تخلیقی جمالیات کا مرکز ہے۔ وفاؔ لکھنوی کی غزلیں شخصیت کی فطری توانائی اور فکری تازگی کا خوب صورت نمونہ ہیں۔ احساس کی تازہ کاری زندگی کی برہنہ سچائیوں سے روبرو ہونے اور تلخ تجربوں سے گزرنے کے بعد بھی سرسبز و شاداب رہتی ہے۔ شعری آہنگ کی نرمی اور حلاوت کے سبب ان کا لہجہ سادگی اور شائستگی سے معمور ہے۔ جذبوں کی تہہ داری، فکر کی بالیدگی، تازگیِ احساس اور تخلیقی بصیرت کے ساتھ ساتھ اردو کی زریں شعری روایت کا منجھا ہوا شعور ان کی غزلوں کو جمالیاتی دستاویز بنا دیتا ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

شانِ معراج

سیدہ شانِ معراج عصرِ حاضر کی معروف شاعرہ ہیں۔ان کی ولادت ۲۲؍جولائی ۱۹۴۸ء کوشاہ جہاں پور (اتر پردیش) میں ہوئی۔ان کا نام شفق آرا اور عرفیت شانِ معراج ہے۔محترمہ نے شاعری کی دنیا میں سیدہ شانِ معراج کے نام سے قدم رکھا اور شہرت حاصل کی۔ان کے والدین سید اشفاق حسن اور سیدہ حسن آرا بیگم دونوں ہی شاہ جہاں پور کے باشندہ تھے۔ان کے نانا جناب ولی حسن کا شمار فارسی کے مقتدر و مقبول شعرائمیں ہوتا تھا۔بیسویں صدی کے اوائل میں شاہ جہاں پور میں ان کا ذاتی چھاپا خانہ 'نامی پریس' کے نام سے مشہور تھا۔جہاں سے وہ ایک ادبی رسالہ 'مرقع' نکالتے تھے (یہ معلومات دورانِ گفتگو فون پر شان صاحبہ سے حاصل ہوئیں)۔شانِ معراج کے شریکِ حیات سید رونق رضا مشہور وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ جدید طرز کے شاعر بھی تھے۔اس اعتبار سے گھر کا ماحول علمی اور ادبی ملا۔

شان معراج نے روہیل کھنڈ یونی ورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا اور فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ایسے علمی اور ادبی گہوارے میں پرورش پانے والی شاعرہ کے تخلیقی جوہر کو تو پنکھ پسارنے ہی تھے۔سو ۱۹۷۲ء میں ان کی شعر گوئی کی ابتدا ہوئی۔تب سے آج تک تقریباً چار دہائی ان کا تخلیقی سفر نت نئی منزلوں کی تلاش میں کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

شان معراج غزل و نظم کی تخلیق کے علاوہ مضامین لکھنے میں بھی دل چسپی رکھتی ہیں۔مگر صنفِ غزل سے طبیعت کی وابستگی گہری ہے۔غزلوں پر مشتمل اولین مجموعہ ٔ کلام 'ساحل سیپ سمندر' کے نام سے ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آ کر شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔اسی کا دوسرا اضافہ شدہ اڈیشن ۲۰۱۲ء میں آیا جو میرے پیشِ نظر ہے۔اس کا پیشِ لفظ ظ انصاری نے لکھا ہے۔اس کے

Scanned with CamScanner

علاوہ تین مضامین علی جوادزیدی، جگن ناتھ آزاداورڈاکٹر شیمہ رضوی کے ہیں۔'اپنی بات' کے عنوان کے تحت شانِ معراج نے اپنے فکر پارے پیش کئے ہیں۔۶۳ غزلوں اور ۷ نظموں کو اپنے دامن میں سمیٹے یہ مجموعہ شاعرہ کے جذبہ وفکر کا دلکش نمائندہ ہے۔

ہرفن کار اپنے عہد کا زائیدہ ہوتا ہے۔اس کی حساسیت اپنے وقت کے نشیب وفراز سے آگہی کشید کرتی ہے۔جذبہ وفکر کی لہریں اس کے احساس وشعور کو مرتعش کرتی ہیں تو فنی نمونے وجود میں آنے لگتے ہیں۔شاعری بالخصوص غزل باطنی جذبہ واحساس کی دنیا کو منکشف کرتی ہے۔'ساحل سیپ سمندر' بھی سیدہ شانِ معراج کی درونِ ذات کی تخلیقیت کا اظہاریہ ہے۔غزل جو حدیثِ جاں ہے، جس کے سارے موسم من کے اندر اپنی چھب دکھاتے ہیں۔چاہے سرسبز بسنت بہار ہو یا رت اجاڑ پت جھڑ کی اندرونِ ذات سب کے جلوے جھلک مارتے رہتے ہیں۔غزل کی بنیاد جذبۂ عشق ہے۔یہ عالم گیر جذبہ اپنے اندر ذات سے کائنات تک کی وسعتیں رکھتا ہے۔اردو غزل کی طویل روایت اس امر کی شاہد ہے کہ محبوب کی باتیں کرنا اس صنف کا پہلا فریضہ ٹھہرا۔شعراً کی بالا دستی کے سبب چشم ولب ورخسار کی دل نواز حکایت کلاسیکی غزل کا معتبر سرمایہ ہے۔سو شانِ معراج کے یہاں بھی غزل کے اس لازمی پہلو کی خوب صورت جھلکیاں نسائی تخلیقی ہنرمندی کا اعتراف کرتی ہوئی ملتی ہیں:

چہرے کے رنگ و نور کو میرا ہنر سمجھ
مجھ کو مری نظر سے کبھی جھانک کر بھی دیکھ

●

'مجھ کو مری نظر سے' جھانک کر دیکھنے کے پسِ پردہ شاعرہ کی داخلی ذات منکشف ہونا چاہتی ہے تاکہ دنیا پر اس کے باطنی رمز آشکار ہوں۔اس نادیدہ منظر نامہ کی جھلک وہ اس طرح دکھاتی ہیں کہ:

مرے اظہار کی ایک ایک ادا اس کی تھی
مرے سینے میں چھپا سوزِ دروں بھی وہ تھا

Scanned with CamScanner

میری خودداری مری خوئے انا لے جائے گی
کیا خبر تھی وہ نظر سب کچھ چرا لے جائے گی

●

وہ مرا وہمِ نظر تھا کہ ترا عکسِ جمیل
وہ کون تھا کہ جو منظر کے درمیاں گزرا

●

مڑ مڑ کے دیکھتی وہ نظر کیا گئی مجھے
تا عمر ایک موڑ پہ ٹھہرا گئی مجھے

●

کیسے کیسے دل نشیں خوابوں کے منظر لے گیا
میری آنکھوں سے کوئی نیندیں چرا کر لے گیا

●

اگر چہ طرزِ عمل اس کا ناگوار بھی تھا
مگر وہ میرے تصور کا شاہکار بھی تھا

●

شانِ معراج کے تصور کا یہی شاہ کاران کا ہوش بھی ہے اور جنون بھی۔ساعتِ دید میں جس کا وجود آنکھوں کے کی راحت ہے اور عرصۂ ہجر میں وہی سرِ مژگاں قطرۂ خوں کے چھلک اٹھنے کا سبب بھی:

تھا مرا ہوش بھی وہ میرا جنوں بھی وہ تھا
راحتِ چشم بھی وہ قطرۂ خوں بھی وہ تھا

●

وہ یعنی محبوب گویا شاعرہ کے سارے دکھ، کرب اور اذیت ناکی کا منبع ہے۔تمنائیں جب

حسرتوں کی دھند میں کھو جاتی ہیں تو دکھتے دل کی کسک کچھ اس طرح اشعار میں آئینہ ہو جاتی ہیں۔ ۔

رب کریم کو بھی کیا میری دعا سے بیر تھا
ہجر نصیب کر دیا شوقِ وصال کے سبب

●

بچھڑ کے شام رہی طولِ عمر تک گویا
ٹھہر گیا تھا جو لمحہ وہ پھر کہاں گزرا

●

لے اڑا مجھ کو سرِ راہِ گزر کس کا خیال
کچھ بھی اب یاد نہیں ہے کہ کدھر جانا تھا

●

یہ کیوں چمن میں رہ کے مرا جی اداس ہے
یہ کس کے عکس ہیں جو بیاباں سے آئے ہیں

ہجر کے لمحات جب طویل تر ہو جائیں تو یادیں سوسو روپ دھار کے وادیٔ جاں کی تنہائی میں اپنی نرالی چھب دکھانے لگتی ہیں۔ یہی یادیں دنیا کی تمام زبان و ادب کا سرمایہ ہیں۔ یہ نہ ہوں تو اندرونِ ذات کا سناٹا انسان کو پاگل کر دے۔ یادوں کے کارواں تنہائی کی دھرتی پر ہی خیمہ زن ہوتے ہیں۔ یہ الگ ہی دنیا ہوتی ہے جس میں خود کو گم رکھتے ہوئے فن کار دوریوں کے عذاب جھیل لیتا ہے۔ شان معراج کو بھی اپنی تنہائیاں بہت عزیز ہیں کہ یادوں کے لشکر اپنی چہل پہل سے دکھوں کی ٹیس کم کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔

تری یادیں ہیں اور تنہائیاں ہیں
غضب کی انجمن آرائیاں ہیں

●

جذبوں کا اک طلسم ہے یادوں کا سلسلہ
راہِ وفا سے تا حدِ امکانِ آرزو

Scanned with CamScanner

آئینے عکس سے محروم نگہ منظر سے
اب یہ تنہائی کا عالم ہے کہ سایہ بھی نہیں

●

قید کر لیتے جسے ہم یاد کی زنجیر میں
ایک لمحہ بھی کوئی آرامِ جاں ایسا نہ تھا

●

شام کوئی شامِ تنہائی نہ تھی
آہٹوں کا سا گماں تھا اور ہم

●

دل کی دھڑکن ہے تری یاد میں کتنی دلکش
شب کے سناٹے میں کوئل کی صدا ہو جیسے

فن کار کی ذات کے اندر کئی جہات پنہاں ہوتے ہیں جو اپنے متنوع رنگوں کے ساتھ فن پارے میں جلوہ گر ہو کر اس کی شخصیت کی دھوپ چھاؤں سے آشنا کراتے ہیں۔ اسی نہاں خانے کا انکشاف شاعرہ کے تخلیقی شعور کا اظہاریہ ہوتا ہے۔ جس کے سبب متضاد رنگوں میں جذبہ وفکر عیاں ہوتے ہیں۔ شانِ معراج کے یہاں بھی غزل کی زریں روایت کی پاس داری کے ساتھ ساتھ جذبۂ محبت کے مختلف رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ تنہائیوں کا درد جہاں اداس اور ملول رکھتا ہے وہیں عرصۂ ہجر کو الگ الگ انداز میں گزارنے کا حوصلہ بھی کچھ اس طرح دیتا ہے:

تمام رات تراشے حسیں حسیں پیکر
تمام رات فنِ آزری نے ساتھ دیا
اک عمر کھو کے ہاتھ لگی ہے متاعِ غم
پھر کیوں اسے حیات کا حاصل کہا نہ جائے

●

Scanned with CamScanner

وہ ترا درد سہی وقت کے ہاتھوں کو مگر
تھپکیاں دے کے سلانے کے ہنر آتے ہیں

●

ماضی کو بھول آئے ہم صورتِ حال کے سبب
چہرہ غبار ہو گیا گردِ ملال کے سبب

●

نظر جو پلٹی ہے چھو کر ترے خیالوں کو
بہت اداس بڑی سوگوار آئی ہے

●

کہاں ہم اور کہاں یہ لذتِ غم
یہ سب تیری کرم فرمائیاں ہیں

شانِ معراج کی غزلیں محض ان کے رومانی جذبوں کی آئینہ دار نہیں بلکہ زندگی کے تجربوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئی ہیں۔ زندگی جو حسن سے بھرپور بھی ہے اور سفاک بھی۔ جو اپنی کج ادائی کے باوجود پیاری ہے۔ ان کی نسائی فکر عدم مساوات، معاشرتی اور تہذیبی جبر کو یوں شعر میں پیش کرتی ہے:

آب جو ہوں میں چلو میری حقیقت کم سہی
وقت اک دن یہ بھی طئے کر دے گا دریا کون ہے

●

کس طرح اس کی ہر اک پتھر مزاجی کا غرور
میں نے شیشے میں اتارا یہ کہانی پھر سہی

●

پتھر مزاجی کے غرور کو شیشے میں اتارنے کا کام شاعرہ کی حوصلہ مندی کی خوب صورت مثال ہے۔ یہی جذبہ زندگی سے متعلق ان کی فکر کو نمو اور تحرک دیتا ہے۔ اس اعتبار سے شانِ معراج

Scanned with CamScanner

زندگی شناس شاعرہ جو اپنے اشعار کے ذریعے یوں مکالمہ قائم کرتی ہیں۔

آرزو جینے کی ہے تو جی چٹانوں کی طرح
ورنہ پتے کی طرح تجھ کو ہوا لے جائے گی

●

ایک منظر پر نظر ٹھہرے تو ٹھہرے کس طرح
ہم مزاجِ گردشِ ایام لے کر آئے ہیں

●

روز نیزوں پہ تمناؤں کے سر آتے ہیں
اب مری فتح کے آثار نظر آتے ہیں

●

بگڑ کر بھی مقدر بن گئے ہیں
کٹے شانے مرے پر بن گئے ہیں

●

تشنگی میں امتیازِ گلشن و صحرا کسے
چل پڑیں گے جس طرف ہم کو گھٹا لے جائے گی

●

'ساحل سیپ سمندر' شانِ معراج کی شعر گوئی کا قابلِ قدر مجموعہ ہے جو تقریباً چار دہائیوں کے تخلیقی عمل کا نمونہ ہے۔ لیکن اتنی طویل مسافت کے باوجود اب تک شاعرہ کا انفرادی رنگ اجاگر نہیں ہونے پاتا۔ گو کہ ان کی شاعری امکانات سے بھرپور ہے۔ بہر کیف ان کی شعری خدمات گراں قدر اور لائق تحسین ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

مسعودہ حیات

بیسویں صدی کے نصف آخر میں شاعراتِ اردو کی صف میں شامل ہونے والا ایک معتبر نام مسعودہ حیات کا بھی ہے۔ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو تہذیب و اخلاق، مذہبی عقاید اور تعلیم و تربیت کے اعتبار سے سخت گیر اور قدامت پرست تھا۔ایسے کٹر اور گھٹے ہوئے روایتی ماحول میں حیات نہ صرف یہ کہ اعلا تعلیم حاصل کر کے درس و تدریس سے وابستہ ہوئیں بلکہ زندگی کی آزمائشوں سے برسرِ پیکار ہوتے ہوئے اپنے کھٹے میٹھے تجربوں کو شاعری کی زبان بھی دی جس نے ''بوئے سمن'' کی صورت اردو کے شعری منظر نامہ میں اپنی پروقار موجودگی درج کرائی۔ ''بوئے سمن'' میں چند نظمیں، کچھ رباعیات اور متفرق اشعار کے مختصر انتخاب کے ساتھ ساتھ غزلیں زیادہ تعداد میں ہیں۔شاید غزل کا جادو کسی اور کا ہونے نہیں دیتا۔غزل رمز و اشارات کی ایک طلسمی دنیا ہے جس میں حدیثِ جاں بڑے ڈھکے چھپے انداز میں اظہار کی راہ پاتی ہے۔ شعر گوئی جو ایک طویل مدت تک عورتوں کے لئے شجرِ ممنوعہ ٹھہری تھی جب شاعرات کے تصرف میں آئی تو حکایاتِ دل تیزی سے وجود پانے لگے۔شاعرات کے پیشِ نظر صدیوں پر مشتمل اردو کی شعری روایت کی زریں تاریخ تھی جس سے انہوں نے استفادہ بھی کیا اور مشقِ سخن سے خود کو اس کی صالح روایت کا خوب صورت حصہ بھی بنایا۔

غزل حسن و عشق کی کیفیات کی پیش کش سے عبارت ہے۔ایک شاعرہ کے لیے یہ آزمائش کا مقام ہے کہ پرجوش عشقیہ جذبوں کو ضبط، تحمل اور ٹھہراؤ کے ساتھ اس طرح پیش کرے کہ نسوانی وقار بھی مجروح نہ ہو اور حرمتِ غزل بھی سلامت رہے۔اس اعتبار سے مسعودہ حیات

Scanned with CamScanner

ان پرخطر مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتی ہیں:

یہ جو رنگین تبسم کی ادا ہے مجھ میں
مجھ کو لگتا ہے کوئی میرے سوا ہے دل میں
ایک خوشبو سی ابھرتی ہے نفس سے میرے
ہو نہ ہو آج کوئی آن بسا ہے دل میں

●

پڑتی ہیں اگر دل پہ محبت کی نگاہیں
بڑھ جاتی ہے کچھ اور سنورنے کی تمنا
جہان بھر کی محبت ہمیں ملے نہ ملے
غضب تو یہ ہے ترا آستاں نہیں ملتا

●

میں اپنی ذات سے کیوں کر اسے الگ سمجھوں
کہ میری روح کے اندر اتر گیا ہے کوئی

●

حیاتؔ کی غزلیں محبت کے جگمگاتے آسمان کی ترجمان ہیں۔ محبوب کے قرب کی مسرت اس کے ہجر کا دکھ، اس کی یادوں کی کسک، انتظار کی لذت، خوابوں اور امنگوں کے خوش نما رنگوں سے سجی ہوئی ایک دھنک رنگ دنیا ہے جو شاعرہ کے پرکیف جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے۔ دل کی دھڑکنوں کے آہنگ پر لہراتی ہوئی ان کی آواز کہیں دل گرفتہ سی اور کہیں دھیمی دھیمی کسک لیے ہوئے ہے۔ جذبے کی شدت کو فطری نسائی ضبط کے ساتھ سبک اور رواں میں لہجے میں پیش کرنے کے ہنر سے وہ بہ خوبی واقف ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

وہ پاس تھے تو ہر اک شئے میں دل دھڑکتا تھا
وہ دور ہیں تو کھٹکتی ہے ہر فضا مجھ کو

Scanned with CamScanner

جو تم قریب تھے ہر شئے پہ اختیار سا تھا
یہ چاند اور ستاروں کی رات اپنی تھی

•

یوں بھی ہوتی ہے کبھی پرسشِ احوالِ حیاتؔ
بھیگی آنکھوں سے ہر اک لفظ ادا ہوتا ہے

•

اک یاد کی خوشبو سے مہکی مری تنہائی
تم نے تو جدا ہو کر کی اور مسیحائی

•

دل میں تری نظر کے ستارے اتر گئے
ہر لمحۂ حیات کو جلووں سے بھر گئے

•

تم مری زندگی میں یوں آئے
جیسے ہنستی ہوئی بہار آئے

•

ہمیں نے عشق سے مہکائی دنیا
ہمیں دنیا کو دیوانے لگے ہیں

ایسا نہیں کہ حیاتؔ نے صرف عشقیہ جذبوں کو ہی زبان دی ہے بلکہ ہم عصر ماحول کا پختہ شعور بھی ان کے اشعار میں جا بجا جگنوؤں کی طرح جھلملاتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی فطری دردمندی کے سبب زندگی اور اس کے مسائل کی بھی موثر پیش کش میں کامیاب ہیں۔ ان کی حوصلہ مندی مسئلوں سے نبرد آزما ہونے، عصری صورتِ حال میں بدلاؤ لانے اور عملِ پیہم کی راہ پر گامزن رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس مقام پر ان کے یہاں ترقی پسند خیالات کی واضح جھلک دکھائی پڑتی

Scanned with CamScanner

ہے۔اس کے باوجود ان کا لہجہ جوشیلا ہونے کے بجائے نرم اور مدھم ہی رہتا ہے۔ضبط اور تحمل کا احساس ان کی غزلوں کا ایک اہم وصف ہے۔عصری زندگی کی تلخیوں اور کربناکیوں کے اظہار میں بھی غزل کی نزاکت ہمہ وقت ان کے پیشِ نظر رہتی ہے۔تجربے کے خلوص،مشاہدے کی سچائی اور فن کارانہ ہنر مندی کے سبب ایسے اشعار وجود میں آئے ہیں جو توجہ کے حامل ہیں۔حوصلوں اور امنگوں سے بھرپور یہ اشعار دیکھیں:

ہمیں ہر حادثے نے عزم بخشا
ہمیں طوفان راس آنے لگے ہیں

●

سورج نہ بن سکو تو شمعِ رہ گزر سہی
جینے کا اس جہاں میں کوئی مدعا تو ہو

●

گرمیِ غم سے پگھلتے نہیں ہمت والے
حسنِ تدبیر سے تقدیر بدل دیتے ہیں

●

زمانے بھر کے دکھوں کو گلے لگایا ہے
یہ حوصلہ ہے کہ ہم پھر بھی دل فگار نہیں

●

عصری عہد کی سفاکیوں اور پرفریب سیاسی چالوں سے خبردار کرنے کی کوششیں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں دیکھئے کہ شاعرہ نے انہیں کس کس طرح شعر کے پیمانے میں ڈھال دیا ہے:

گھر سے جو شخص بھی نکلے وہ سنبھل کر نکلے
جانے کس موڑ پر کس ہاتھ میں خنجر نکلے

●

Scanned with CamScanner

ظلمتِ شب کا فسوں اور بڑھا ہے لوگو!
ہر قدم آج اٹھانا ذرا ہشیاری سے

●

ہر سمت خاک وخون ہے ہر لحظہ برق و باد
ایسی تباہیوں کے تو منظر کبھی نہ تھے

●

زندگی کی کڑواہٹوں کو ان لفظوں میں بھی پیش کیا گیا ہے:

اپنے حالات کی تصویر ہے نقشِ ہستی
آئینہ دیکھ کے لازم نہیں حیراں ہونا

●

ہم اپنے گھر میں بھی اب ہیں مسافروں کی طرح
ہر ایک چیز یہاں اجنبی سی لگتی ہے

●

اس بھری دنیا میں اب تو کوئی بھی اپنا نہیں
جیسے تم ہر درد کا رشتہ اٹھا کر لے گئے

●

بند کرلیں کس طرح ہم گھر کا دروازہ حیاتؔ
دل مسافر ہے کبھی تو لوٹ کر گھر آئے گا

●

ایک شاعرہ کے لیے اپنے جذبوں کو زبان دینا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ صنفِ نازک کی حیثیت سے سماج اور معاشرے کے اصول اور رسم ورواج سے دامن بچانا بھی کڑی آزمائش ہے۔ فن کار کا کام ہی جبر کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ ایسے میں حیاتؔ نے نسوانی ذات کی مجبوریوں کو خوب صورت انداز میں شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ جس میں کرب کی لہروں اور بے بسی

Scanned with CamScanner

کی دھیمی دھیمی آنچ سے ان کی تخلیقی دردمندی اور حساسیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

یوں تو خوش رنگ ہیں ہر سمت مری دیواریں
کوئی تو تازہ ہواؤں کے لیے در نکلے

●

ہم فقط دائرے ہی میں چلتے رہے، اپنے نقشِ قدم آپ گنتے رہے
لالہ وگل ہیں کیا برق و باراں ہے کیا، ہم نے دیکھا نہ کوئی سماں دوستو

●

لگی ہیں شعلہ بیانی کی تہمتیں اکثر
ہم ان کے شہر میں ہر چند بے زبان رہے

●

کس سے شکوہ کریں ویرانیِ ہستی کا حیات
ہم نے خود اپنی تمناؤں کو جینے نہ دیا

●

خوش رنگ دیواروں کے حصار میں مقید رہنا صدیوں سے نسوانی ذات کا مقدر رہا ہے۔ دائرے کے اندر مسلسل مسافت اور فکر وخیال پر روایت کے نادیدہ پہرے ہوں تو گھٹن کے ماحول میں کسی روزن کی تلاش لازمی ہے۔ تازہ ہواؤں کی آرزو زندگی کے چراغ کی لو کو مدھم نہیں ہونے دیتی۔ احتجاج کی یہ لہریں ہلکی سہی لیکن اپنے عہد کے اعتبار سے قابلِ توجہ ضرور ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی مسعودہ حیات کی غزلیں نہ صرف کلاسیکی رچاؤ کے حسن سے لب ریز ہیں بلکہ بالیدہ عصری شعور کے سبب زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاس بھی ہیں۔ 'بوئے سمن' کے حوالے سے شاعرات کی صف میں ان کا نام اہم مقام کا حامل ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

صدیقہ شبنم

حیدرآباد صدیوں سے شعروادب کا گہوارہ رہا ہے۔ وہاں نہ صرف یہ کہ اردو زبان کی پرورش و پرداخت ہوئی بلکہ شعروادب کی مشہور اصناف میں بھی گراں مایہ تصنیفات آج بھی اردو کا اولین اور عظیم سرمایہ ہیں۔ صدیقہ شبنم بھی زرخیز اردو علاقہ حیدرآباد کی پروردہ ہیں۔ ان کی تخلیقی شخصیت تہذیبِ غزل کی زائیدہ ہے۔ فی الحال وہ اپنے شوہر عبدالقادر حبیب کے ساتھ برطانیہ میں مقیم ہیں۔ 'تنہائی' شبنم کا اولین شعری مجموعہ ہے۔ جو تغزل کے قدیم اور جدید رنگوں کے امتزاج کا نفیس منظرنامہ ہے۔

غزل کا فن خیال کی لطافت، احساس کی شدت، جذبے کی صداقت اور اظہار کی تہذیب سے عبارت ہے۔ شبنم کی غزلوں کا کینوس وسیع ہے۔ آفاقی قدروں کی آگہی، نئے شعری رجحانات اور باطنی تجربوں کے توازن کا شعور ان کی کاوشوں کو جمالیاتی وقار عطا کرتا ہے۔ اپنے دیس کی مٹی سے دور پردیس میں سنسار بسانے کی مجبوریاں اور فرصت کے لمحوں میں وطن اور اس کی فضاؤں کی یاد مہاجر ادیب و شعرا کی تخلیقیت کے سبب بیسویں صدی کے شعروادب کا نمایاں موضوع رہی ہے۔ تنہائی' کا پہلا شعر ہی توجہ کھینچ لیتا ہے:

کوئی سایہ نہیں غبار نہیں
کتنی تنہا ہے اپنی تنہائی

●

'تنہائی' استعارہ ہے عصری زندگی کا۔ شبنم نے اس لفظ میں لامتناہی وسعتوں کو سمیٹ دیا ہے۔ آج تنہائی ایک کائناتی حقیقت بن گئی ہے، جس کو جھیلنا ہر زندہ اور حساس انسان کا مقدر

Scanned with CamScanner

ہے۔شاعرہ کی تنہائی میں دیارِ غیر کی اجنبیت بھی ہے اور ہجرت کا الم بھی، بھرے پورے خاندان سے بچھڑ جانے کا دکھ بھی ہے اور اپنے دیس کی سوندھی مٹی سے ہزاروں میل دور ہونے کا کرب ناک تصور بھی۔شاید انہیں احساسات کے پیش نظر صدیقہ شبنم نے اپنی کتاب کا نام 'تنہائی' رکھا۔

غزل اپنے تخلیق کار کے داخلی کیفیتوں اور تجربوں کو منکشف کرتی ہے۔شبنم کی شدید داخلیت ان کی تخلیقی توانائی میں ڈھل جاتی ہے۔جن سے ان کی نسائی ذات اور جمالیاتی شعور کی شناخت ہوتی ہے۔ان کی غزلوں میں نسائی فکر و کیف کے مختلف رنگ جلوہ گر ہیں۔تنہائی کے ورق پر شدتِ احساس کے مناظر کچھ اس طرح شعر میں ڈھل گئے ہیں:

ادھ کھلی آنکھوں پہ رکھ کے دیر تک اس کی کتاب
جانے کیا سوچا کئے ہم آنسوؤں کے درمیاں

●

تنہائی میں اکثر مجھے محسوس ہوا ہے
جیسے کوئی چپکے سے مجھے دیکھ رہا ہے

●

زخموں کی وادیوں میں بلا کا سکوت تھا
ہم دل کی دھڑکنوں کی صدا ڈھونڈتے رہے

●

کس قدر وابستہ ان سے ہوگئی ہے زندگی
ہر صدائے دل پہ ان کے نام کا دھوکا ہوا

●

ایک شبنمی احساس ہے جو ان کی غزلوں میں موج زن ہے۔محبت ایک آفاقی جذبہ ہے جس کا لطیف اور نزاکت بھرپور تجربہ صدیقہ شبنم کی شاعری میں بھی موجود ہے۔وہ ان کیفیات کو شائستگی اور نفاستِ خیال کے ساتھ پیش کرتی ہیں:

نفرت بھی اسی کی ہے محبت بھی اسی کی
سوغات ہے یہ درد کی دولت بھی اسی کی

Scanned with CamScanner

یہ لمحہ بھی ، اس لمحے کی مہلت بھی اسی کی
جو دید سے محروم وہ ساعت بھی اسی کی
وہ ساتھ تھا شبنمؔ تو ہواؤں پہ قدم تھے
اب ڈوب گئے ہم تو ندامت بھی اسی کی

●

یاد کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے اس طرح
بس نظر کے سامنے وہ ایک ہی چہرہ رہا

●

پھر یاد کے زینے پہ اک آہٹ سی ہوئی ہے
سوچوں کے دریچوں میں کوئی آن کھڑا ہے

●

گفتار کا انداز حلاوت کی طرح ہے
اس شخص کی ہر بات محبت کی طرح ہے

●

خواب آنکھوں میں نظر میں رنگ بھر جاتی تھی جو
کچھ دنوں سے گھر میں وہ پاگل ہوا آتی نہیں

●

اجنبی سرزمین پر ہواؤں کی بے رخی کے درمیان قدم جمائے رکھنا ہی شبنمؔ کے لیے کافی نہیں بلکہ زندہ وجود کے ساتھ دل کی دنیا آباد رکھنے کی کوشش ایک کڑی آزمائش بھی ہے۔ وطن اور رشتوں سے بچھڑنے کے بعد شاعرہ کے فکر واحساس کا سفر مستقل جاری ہے۔ اس بے انت سفر میں یادوں کی پرچھائیاں لرزتی کانپتی ساتھ نبھاتی نظر آتی ہیں۔ اجنبی دیار کی بیگانگی، ناشناسائی، اخلاقی قدروں کی عدم موجودگی، بے حسی اور مشینی زندگی کے تجربے ان کی شاعری کے نمایاں موضوعات

Scanned with CamScanner

ہیں۔لایعنی سفراور بے منزلی کا کرب شاعرہ کے اندر گہرائی میں رچ بس گیا ہے۔سفر کی مناسبت سے شعری تلازموں کا خوب صورت استعمال اشعار کو جاذبیت عطا کرتا ہے۔کچھ اشعار دیکھئے:

کیوں دے دیا ہے مجھ کو کڑی دھوپ کا سفر
ابرِ بہار !سا یۂ رحمت کو کیا ہوا

●

یہی کڑی دھوپ کا سفر شاعرہ کا مقدر بنا ہوا ہے۔اس مسافرت میں کتنے نشیب وفراز سے شبنم کا گزر ہوا، کیا کیا مرحلے درپیش رہے، کیسے کیسے نقش بنے اور مٹے،ان سارے تجربوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو'تنہائی' میں موجود ہے۔مہاجرت اور خانہ خرابی کے درد سے پر یہ اشعار ان کے فکری اور جذباتی پہلوؤں کے عکاس ہیں:

دکھ اور طرح کے ہیں عذاب اور طرح کے
اس راہ میں آئے ہیں سراب اور طرح کے
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں خواب اور طرح کے
ہم لوگ کہ ہیں خانہ خراب اور طرح کے

●

اس دشتِ اضطراب کی تنہائیاں نہ پوچھ
ڈھونڈے سے بھی ملا نہ کوئی آدمی مجھے

●

اک تلاش آب میں کتنے سرابوں سے ملے
قریہ قریہ کو بہ کو ہم تشنہ لب گھوما کیے

●

کیا جانے کس تلاش میں صدیاں گزر گئیں
بے نام منزلوں کا پتا پوچھتے رہے

Scanned with CamScanner

تا دور دیکھئے وہ سرابوں کا سلسلہ
اب راستے میں کوئی سمندر نہ آئے گا

●

طے یہ پایا ہے کہ اب دھیان نہ گھر میں رکھنا
ہے جو درپیش سفر پاؤں سفر میں رکھنا

●

عہدِ حاضر میں جہاں کہنے کو فاصلے سمٹ گئے ہیں اور پل پل دنیا کا حال خبرناموں سے مل جاتا ہے، وہیں احساس کی سطح پر ٹوٹتے رشتے اور بڑھتی دوریوں کے کرب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ صدیقہ شبنم ایک باشعور اور دردمند فن کار کی مانند بین الاقوامی سطح پر انسانوں کے درمیان بڑھتی اس خلیج کو شعر کا موضوع بناتی ہیں۔ غائب ہوتی شناخت کے ساتھ اجنبی چہرے، خودغرضی کے تانے بانے بنتا مشینی ماحول، ضرورت کے مطابق بنائے گئے رشتے ناتے، ہم زبانوں کی غیر موجودگی، کسی اپنے کی تلاش میں بے چین روح، ایسے بہت سارے اسباب شاعرہ کو دکھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسے وقت میں کبھی وہ ماضی کی وادیوں میں بسیرا ڈالتی ہیں اور کبھی ساتھ ہونے والے تجربوں کو زبان عطا کرتی ہیں۔ ماضی اس طرح یادوں میں در آتا ہے کہ:

ٹوٹ کر اندر سے بکھرے اور پھر جل تھل ہوئے
ہم بچھڑ کر تجھ سے اتنا روئے کہ بادل ہو گئے

●

رشتۂ درد کا احساس دلاتا ہے مجھے
یاد آتا ہے تو پہروں وہ رلاتا ہے مجھے
یہ بھی سچ ہے کہ ہے مٹی سے محبت مجھ کو
اور کہیں دور سے دریا بھی بلاتا ہے مجھے

اور پھر حال کی گزرگاہ پر لوٹنے کا منظر کچھ یوں جھلملاتا ہے کہ شاعرہ کی بے بسی اور بے کسی

Scanned with CamScanner

کا کرب قاری کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ان کے اشعار کی کامیابی کا راز بھی اسی میں ہے کہ سیدھے دل پر اثر کرتا ہے اور ذہن کو ترقی یافتہ ملکوں کے روحانی زوال سے آشنا کراتا ہے:

اس فضائے فرنگ میں شبنم
مدتوں بے زباں رہے ہیں ہم

●

یہ آئینہ خانہ ہے عجب شیشہ گرو! یاں
جو نقش ابھر آئے وہ حیرت کی طرح ہے

●

کیا جانے چلے آئے ہیں کس راہ پہ شبنم
ہم دوش پہ یہ بارِ مہ و سال اٹھائے

●

حدودِ عرصہ گہہِ ذات سے گزر جائیں
خلا میں دور۔ بہت دور تک بکھر جائیں
تلاشِ منزلِ خوشبو کی راہ میں شبنم
نہ جانے کتنی بہاروں کے خواب مر جائیں

●

بے چہرہ ہوئے آج مگر کس سے شکایت
آئینہ اسی کا ہے تو حیرت بھی اسی کی

●

ہم خود بھی اپنی ذات سے شبنم نہ کھل کے مل سکے
مصلحت اندیشیوں کا درمیاں پردہ رہا

●

Scanned with CamScanner

ایک سایہ ہے تعاقب میں صدا رہتا ہے
ایک آسیب ہے دن رات ستاتا ہے مجھے

●

پھر اک جہان تازہ کے اسرار کھل گئے
لے آئی کس مقام پر یہ آگہی مجھے

●

ایک آواز کا چہرہ ڈھونڈوں
ایک آہٹ کو گزرتا دیکھوں

●

زندگی سے ملے ہوئے شبنم
بس زمانہ گزر گیا کوئی

●

وقت کم ہے کچھ کہو پھر ان کہا رہ جائے گا
زندگی بھر دل میں ورنہ وسوسہ رہ جائے گا

صدیقہ شبنم اشعار میں اس جہانِ تازہ کے اسرار کھولتی ہیں جس کے سحر میں آج کا جدید ذہن الجھ کر رہ گیا ہے۔ اجنبی ماحول اور فضا کے درمیان شاعرہ جیسے زندگی سے ہی بچھڑ گئی ہیں۔ ایسے میں ان کی فکری آگہی انہیں وقت کے گزرتے جانے کا احساس دلا کر سب کچھ کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ زمانے کو اس آئینہ خانہ کے طلسم کی خبر ہو۔ جہاں انہیں مدتوں بے زبانی کا کرب سہنا پڑا، جہاں انہیں آوازوں کے چہرے تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے، 'تنہائی' اسی اندرونی چھٹ پٹاہٹ کا اظہار ہے۔ دلاویز تلازموں اور مترنم آہنگ کی آمیزش سے صدیقہ شبنم کی غزلیں پر کیف اور دل نشین نظر آتی ہیں۔ تنہا تنہائی، وجود کا جل تھل ہونا، بادل ہونا، بادل کی چادر، آواز کا چہرہ جیسی تراکیب نہ صرف اشعار کی تہہ داری اور معنویت میں اضافہ کا سبب ہیں بلکہ ان کے جمالیاتی شعور اور شائستگی فکر کی مظہر بھی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے 'تنہائی' ان کی نسائی شخصیت کی نزاکت، تخلیقی بصیرت اور لب و لہجہ کی غنائیت کی قابلِ قدر دستاویز ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

مظفر النساء ناز

مظفر النسأ ناز کی ولادت ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ان کے والد محمد خواجہ صاحب تھے جن کا تعلق حیدرآباد کے ایک معزز تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ناز کی شادی کم سنی میں ہی فخر الدین نیاز سے ہوگئی جب وہ دسویں کی طالبہ تھیں۔انہوں نے ویمنس کالج ،حیدرآباد سے ۱۹۶۵ء میں بی اے کیا اور بعد میں رانچی یونیورسٹی سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ دو سال تک حیدرآباد سکریٹریٹ میں ملازمت کے بعد ۱۹۷۱ء سے مستقل الکٹرسیٹی بورڈ دیوت سودھا میں سبکدوش ہونے تک کام کرتی رہیں۔اس کے علاوہ اپنے ذاتی اسکول 'روز بڈس ہائی اسکول' کی شاخیں صنعت نگر اور ایراگڈا میں خوش اسلوبی سے چلا رہی ہیں۔'محفلِ خواتین' حیدرآباد کی بانی ممبروں میں سے ہیں اور اس کی خازن بھی ہیں۔باہری ذمہ داریوں کے ساتھ خانگی زندگی کو بھی ہنر مندی سے نبھانے کے فن میں طاق ہیں۔وہ ایک بہترین بیوی اور شفیق ماں ہونے کے ساتھ ہی اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۶۱ء میں ہوئی اور پہلی غزل 'واسودھا' میں شائع ہوئی۔جو جامعہ عثمانیہ کی طالبات کی شعری اور ادبی سرگرمیوں کا ترجمان تھا۔اب تک ان کے تین شعری مجموعے اشاعت کے مرحلوں سے گزر کر ادبی حلقوں میں خراج تحسین پا چکے ہیں ۱۹۸۴ء میں 'بات پھولوں کی' ۱۹۹۸ء میں 'روشنی' اور ۲۰۰۵ء میں 'کتنا روشن میرا گھر ہے' ان کے تخلیقی سفر کی شاعرانہ روداد ہیں۔

مظفر النسأ ناز کی غزلوں کا مزاج رومانی ہے۔حالاں کہ مستقل عملی زندگی سے ان کا جڑاؤ رہا ہے لیکن شاعری دل کی وادیوں میں آتی جاتی رتوں کے رنگوں سے ہی عبارت ہے۔زمانے کے ساتھ گہری وابستگی کے باوجود کہیں کہیں اس کی ہلکی ہلکی پرچھائیں سی ڈولتی نظر آتی ہے۔ان کی فکر

Scanned with CamScanner

ضرور انہیں عمل آمادہ رکھتی ہے۔ جس کا اظہار وہ کچھ اس طرح شعر میں کرتی ہیں کہ:

●

ہنگامہ پسندی ہے نئے دور کی تقدیر
ہر لمحۂ خاموش مرے دل پہ گراں ہے
ٹھہرے ہوئے لوگوں کا کوئی ساتھ نہ دے گا
اے وقتِ گریزاں تیرے چہرے سے عیاں ہے

●

غالباً روشنی کا مارا ہے
جو اجالوں میں بھی بھٹکتا ہے

●

دانستہ اپنے آپ سے لپٹے ہوئے ہیں لوگ
تنہائیوں کا درد بھی اب کس کو راس ہے

●

مایوسِ کرم تو نہیں لیکن دلِ تنہا
سب لوگ یہاں پیاسے ہیں کس کس کو پکارے

●

ہنگامہ پسندی ہے نئے دور کی تقدیر
ہر لمحۂ خاموش مرے دل پہ گراں ہے

●

پیاس صدیوں کی لیے ہونٹوں پہ اب بھی کچھ لوگ
ایسا لگتا ہے کہ ہیں اپنے گھرانے والے

●

Scanned with CamScanner

نہ گفتگو میں تسلی نہ خامشی میں صدا
سلوکِ دوست کا انداز ہی نرالا ہے

●

یہ روشنی کا تسلسل بجا سہی لیکن!
یہ حادثے بھی ہمیں فکر مند کرتے ہیں

●

خدا ہی جانتا ہے کس کی کیا ہے محرومی
رئیسِ وقت بھی کشکول لے کے پھرتا ہے

●

ان اشعار سے قطع نظر نازؔ کا مجموعی رنگ کلاسیکی شعری روایت کا زائیدہ ہے۔ جہاں محبوب سے متعلق باتیں ہیں۔ ہجر و وصال کی حکایتیں ہیں، یادوں کا جھلملاتا گوشہ ہے، سوچ کی ابھرتی ڈوبتی پرچھائیاں ہیں اور دکھ کی مدھم مدھم کسک ہے۔ جنہیں وہ اپنی نسائی فطرت کی سادگی اور سچائی سے بیان کر جاتی ہیں۔ حیدرآباد جس کی بین الاقوامی شناخت اردو کے قدیم گہوارے کے طور پر ہوتی ہے، عہدِ جدید میں بھی اردو شعر و ادب اور اس کی تہذیب کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اس لیے وہاں شعراُ کے ساتھ ساتھ شاعرات کی بھی قابلِ ذکر تعداد شعر و ادب کی خدمات میں مشغول ہیں۔ افسانہ، تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی عورتوں نے اپنی باوقار موجودگی درج کرائی ہے۔ مظفر النساُ نازؔ نے شاعری کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ غزل ایک داخلی صنفِ سخن ہے اس لئے اس میں تخلیق کار کے باطنی جذبات نمایاں ہوتے ہیں۔ جذبۂ عشق بھی انسان کا باطنی جذبہ ہے۔ یہی جذبہ کائنات کی بنیاد بھی ہے اور انسان کی سرشت بھی۔ اس سے زندہ وجود کو مفر نہیں۔ اس کی وسعتیں لامحدود ہیں، کہیں یہ انسان اور انسان کے درمیان پنپتا ہے، کبھی فطرت کے مظاہر میں رنگ دکھاتا ہے، آسمان پر چاند، سورج اور تاروں میں جگمگاتا ہے، جھرنوں میں شور مچاتا، ساگر کی موجوں میں اٹکھیلیاں کرتا، بادلوں کے سنگ اڈتا دھرتی کو سیراب کرتا، کبھی اونچے پہاڑوں پر بسیرا کرتا، چڑ

Scanned with CamScanner

یوں کی چہکار بنتا، پھولوں کی مسکان میں سماتا اور کہیں بچوں کی معصوم کلکاریوں میں کھلکھلاتا ہے۔غرض اس کے لاکھوں رنگ ہیں جو کائنات میں جلوہ گر ہیں۔اردو شاعری نے بھی اس کی نیرنگیوں سے اپنی تاریخ کو دھنک بنایا ہے۔

مظفر النسآ ناز بھی حکایتِ دل و جاں کی شاعرہ ہیں۔مصروف زندگی سے لمحے چرا کر اپنے نہاں خانہ میں زینہ زینہ اترتی، کبھی پھولوں کی بات کرتی، کبھی روشنی کی کرنوں سے زندگی کو درخشاں کرتی اور کبھی اس سے سارے گھر کو روشن کرتی نظر آتی ہیں۔جب معاملہ حدیثِ دل کا ٹھہرے تو بات عشقیہ جذبوں کی ہی ہوتی ہے۔شاعرہ نے بھی ان ہی جذبوں اور کیفیتوں کو غزل میں پیش کیا ہے۔محبوب سے وابستگی کا احساس، اس سے دوری کا دکھ، ملنے کی چاہت اور یادوں کی کسک ان کے اہم موضوعات ہیں۔جنہیں وہ شائستگی اور سچائی کے ساتھ عام فہم لہجے میں پیش کر دیتی ہیں:

یہ سمجھ کے چلتی ہوں تیرا نقش ِ پا ہوگا
میں جہاں سے گزروں گی تیرا سامنا ہوگا

●

میں بکھر چکی ہوں پھر بھی مری آرزو یہی تھی
ترا نام جس جگہ ہے وہیں میرا نام ہوتا

●

ہر اک قدم پہ کئی راستے بدلتا ہے
وہ کون ہے جو مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

●

قدم اٹھائے ہیں ہم نے بھی اس یقین کے ساتھ
جہاں سے گزریں گے ہم تیری رہ گزر ہوگی

●

Scanned with CamScanner

اک نہ اک دن تو میں پوچھوں گی مظفؔر اس سے
برہ کی آگ میں اس طرح جلاتا کیوں ہے

●

ہم تری سنگ دلی سے بھی نہیں ہیں مایوس
لوگ کہتے ہیں کہ پتھر میں خدا ہوتا ہے

●

گزرے ہوئے لمحوں کو اب ساتھ ہی رہنے دو
کچھ دن کی نہیں ان سے برسوں کی رفاقت ہے

●

لطیف جذبۂ دل عشق کی امانت ہے
زمانہ بیت گیا آپ کو بھلا نہ سکے

●

یہ زندگی تو مسلسل سفر ہے چلنا ہے
تمام عمر چراغوں کی طرح جلنا ہے
پیار کرنے والوں کا صرف ایک صحرا ہے
سارے شہر اس کے ہیں ساری بستیاں اس کی

نازؔ کی شاعری ان ہی داخلی تجربوں اور کیفیتوں کی ترجمان ہے۔ سادہ لب و لہجے میں اپنے خیال کے اظہار کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ گو کہ ان کا رنگِ سخن روایتی ہے پھر بھی کہیں کہیں ایسے اشعار توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ جیسے:

شہر میں تیرے کھو گئے ایسے
یاد آیا نہ گھر قیامت تک

●

Scanned with CamScanner

اڑ گئے نیند کے پرندے بھی
آنکھ ویران سی حویلی ہے
دور تک چاند ہے نہ تارے ہیں
آج تو رات بھی اکیلی ہے

●

شہر کی بھیڑ میں آنکھیں جسے کھو دیتی ہیں
دل کے آنگن میں وہی شخص کھڑا ہوتا ہے

●

یہ سب اوراق میں نے لکھے ہیں
پھر بھی میرا کہیں پہ نام نہیں

●

بہرکیف مظفر النساء نازؔ کی غزلیں روایتی رنگِ تغزل سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے ان کی شاعرانہ اور دردمند شخصیت کی کامیاب عکاسی کرتی ہیں اور نسائی اردو غزل کے سرمائے میں ان کی تخلیقی کاوشیں اہم مقام کی حامل ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

سیما نظمی

ان کا نام ہاشمیہ بیگم اور تخلص سیما تھا۔ان کی پیدائش ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو رامپور میں ہوئی۔ان کے والد کا نام سید کامل حسین کامل اور والدہ کا گیتی آرا بیگم تھا۔ان کے ایک چچا مولانا سید ظفر مہدی مرحوم مہاراجا محمود آباد محمد امیر احمد خاں کے استاد تھے۔دوسرے چچا شمس العلماً سید سبط حسن اپنے عہد کے مشہور اور عالی مرتبت خطیب تھے۔کامل جیسے استاد شاعر کا خاندان نہ صرف لکھنؤ بلکہ مشرق وسطی میں خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور تھا۔کیوں کہ ان گنت ممتاز علماً اور شعراُ اس خاندان کی دین ہیں۔ایسے علمی اور تہذیبی گھرانے کی فرد ہونے کے سبب سیما نظمی میں بھی شعرو سخن کا ذوق موروثی ہے۔پھر ان کی شادی بھی مشہور صحافی ،ادیب اور شاعر مہدی نظمی سے ہوئی تو ان کے ذوق وشوق کو مزید جلا ملی۔ان کی غزلیں زبان وبیان پر ان کی گرفت کا نمونہ ہیں۔'ریزۂ الماس' کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔جس کے ساتھ ہی وہ ایک کہنہ مشق شاعرہ کے طور پر اردو غزل کے کارواں میں شریک سفر ہوئیں۔

سیما نظمی نے زندگی کے تنوع کو غزل میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ان کے اشعار ان کے جذباتی اور انفرادی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کا عکس بھی سمیٹے ہوئے ہیں۔ان کے پختہ تخلیقی شعور نے اپنے ماحول کے سماجی ،سیاسی ،معاشرتی اور تہذیبی نشیب وفراز کو جمالیاتی رنگ بخشا ہے۔ان کے یہاں ہم عصر حسیت کے ساتھ ہی قدیم شعری روایت کا احترام بھی ہے اور دونوں کے درمیان خوب صورت توازن بھی۔ایک باشعور فن کار کی مانند سیما نظمی کی نگاہیں ملک میں پھیلی ہوئی بے اطمینانی کا جائزہ لیتی ہیں۔آزادی جو غلامی ،غربت وافلاس اور نابرابری کا خواب سمجھی جارہی تھی ،جب ملی تو بھیانک تعبیروں سے انسان کی روح تک جھلس گئی۔تقسیم ہند کے سانحے

Scanned with CamScanner

نے آدرشوں کے سارے طلسم خانے ڈھادئے۔ سارے تہذیبی اور اخلاقی اقدار و عقائد انتشار اور بے یقینی کے سمندر میں ڈوبتی کشتیوں کی طرح ہچکولے کھانے لگے۔ ہنستے بستے شہروں کی تاراجی ،فساد کی خوں ریزی اور انسان کی لاچاری کا دکھ ہر حساس فن کار کا مقدر ٹھہرا۔ سیما نظمی کی حساس طبعیت نے بھی ان دکھوں کو اپنی شاعری کے دامن میں سمیٹنا چاہا:

زندگی بھوکی بھکارن کی طرح
در بدر پھرتی ہے سارے شہر میں
حادثوں کی گرد میں لپٹے رہے
موت کے کتنے نظارے شہر میں

●

صحرا نشیں ہیں آج مگر کل چمن میں ہم
پھولوں کی آبرو تھے ذرا یاد کیجئے
رنگیں ہے جن کے خوں سے فضائے بہارِ گل
وہ سرفروش ہم تھے ذرا یاد کیجئے

●

دریا کا تذکرہ نہیں ساحل کی بات ہے
ٹھہرے ہوئے سفینوں میں طوفاں بہت ملے

●

اخلاص کے سکے کھوٹے ہیں، ایثار کے موتی جھوٹے ہیں
یہ کیسا سمئے ہے اے لوگو ہے خون کی رنگت پانی سی

●

چلچلاتی دھوپ میں سر کو چھپانے کے لئے
ریگ زارِ زندگی میں دور تک سایہ نہیں

عصری سچائیوں کے تلخ تجربے اور انسان کے بے انت درد کے سلسلوں کو دیکھ شاعرہ کی فطری ہم دردی ان کے زخموں پر مرہم رکھنے لیے تحریک دیتی ہے۔ حصول آزادی کے بعد کچھ لوگوں

Scanned with CamScanner

کوخوش دیکھ کر سیما نظمی اس طرح اپنا خیال ظاہر کرتی ہیں:

گو جشنِ دید فصلِ بہاراں بہت ہوئے
سیماؔ مگر یقینِ بہاراں نہ ہو سکا

●

اجڑی ہوئی تہذیب کے زندہ ہیں فسانے
محلوں میں سنی جاتی ہیں کھنڈرات کی باتیں

●

وہ لوگ جو ڈرتے تھے کبھی موج بلا سے
اب دیر سے طوفاں کی دعا مانگ رہے ہیں

●

دیوار و اداس ہے زنداں کے ساتھیو
زنجیر ہی بجاؤ کہ دل بستگی رہے

●

یہ جھلملاتے کچھ عکس سیماؔ نظمی کے اسی مخصوص عہد کے ہیں۔ اردو غزل کی بنیاد چوں کہ عشق ہے اس لیے شاعرہ کے یہاں بھی اس کی لہریں اور ترنگیں اپنی رنگینیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ان کا تصورِ عشق اپنی وسعت کے اعتبار سے بلند اور پاکیزہ ہے۔ یہ جذبہ دلوں کو کیف اور سرور کے ساتھ ساتھ امنگ اور حوصلہ بھی دیتا ہے۔ انہوں رومانی احساسات اور کیفیات کے دلکش پیکر بنائے ہیں جن کا تحرک بڑا دل آویز ہے:

خواب میں کون مسکرایا ہے
بند آنکھوں میں کس کا سایہ ہے

●

ریگ زارِ خیال سے ہو کر
دل میں چپکے سے آ گیا کوئی
دل کسی بات میں نہیں لگتا
جانے کیا بات کہہ گیا کوئی

Scanned with CamScanner

●

حسین یادیں گزرتی ہیں اس طرح دل سے
کہ جیسے مصر سے یوسف کا کارواں گزرے

●

پاس ادب تھا عشق کو ورنہ جمال یار
اتنا قریب تھا کہ کوئی دوسرا نہ تھا

●

ذوق نگاہِ عشق میں ہر شئے ہے آئینہ
جس سمت دیکھئے ترا چہرہ دکھائی دے

●

کس کا جمال ہے کہ ستاروں کی چھاؤں میں
جب بھی نظر اٹھی تو رہی جھلملا کے آنکھ

ذوقِ نگاہ اور عشق کی کرشمہ سازی کا پرکیف بیان اثرانگیز ہے کہ بند آنکھوں میں بھی سایہ سا گزر جاتا ہے۔دل فریب یادوں کا ہجوم کا بھی یوں گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے مصر سے کاروانِ یوسف۔شاعرہ کا رنگین تخیل ان تصویروں میں ایسے پیارے پیارے رنگ بھرتا ہے کہ ہر منظر جی اٹھتا ہے۔وہ آدابِ سخنوری کے تمام تقاضوں سے بہ خوبی واقف ہیں۔انہیں جذبۂ عشق کا عرفان بھی ہے اور حسن کی نفاست ونزاکت کی شناخت بھی۔ان کا تخیل ماورائی نہیں وہ ایک حقیقت پسند شاعرہ ہیں۔وہ ہجر کی تنہائیوں میں گریہ کناں نہیں ہوتیں بلکہ یادوں کی روشنی سے چراغاں کرتی ہیں۔ان لمحوں کی جگمگاہٹ سے وہ اس طرح اپنے اشعار کو درخشانی عطا کرتی ہیں:

یہ تصور ہے تری انجمن آرائی کا
میری تنہائی بھی آباد ہے محفل کی طرح

●

حسرتِ دید سلامت کہ مری آنکھوں میں

Scanned with CamScanner

جب بھی چاہوں تری تصویر نظر آئے گی

اچھی شاعری زندگی کے بالیدہ شعور، انسان دوستی، روایتی قدروں کے احترام اور جمالیاتی احساس کے توازن سے جنم لیتی ہے سیما نظمی کی غزلیں اسی توازن کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے شعری مزاج کی تشکیل میں نہ صرف اردو شاعری کی عظیم روایت کا حصہ ہے بلکہ خاندانی اور تہذیبی ماحول کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ خیال کی شادابی، جذبے کی سرشاری، پر اثر لہجہ اور فن کارانہ ہنر مندی ان کی غزلوں کے اہم اوصاف ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

کشورناہید

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں نسوانی نفسیات و جذبات کے بے باکانہ اظہار کے سبب جدید اردو شاعری میں کشورناہید ایک منفرد نام ہے۔انہوں نے ۱۹۶۱ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا اور پاکستان میں ڈائرکٹر آف انفارمیشن کے عہدے پر سرفراز رہیں۔ان کے چار شعری مجموعے منظرِ عام پر آکر مقبولیت کی سند پا چکے ہیں۔انہوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنے فکروفن کے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔'لب گویا'' بے نام مسافت'' ملامتوں کے درمیاں' اور' گلیاں دھوپ دروازے' کی شاعری ان کے تخلیقی سفر کی آئینہ دار ہیں۔ترجمہ نگاری اور کالم نگاری بھی ان کا خصوصی مشغلہ رہا ہے۔نثری کاوشوں میں' بری عورت کی کتھا' ان کی مشہورِ زمانہ تصنیف ثابت ہوئی۔'لبِ گویا' کو ۱۹۶۹ء میں آدم جی پرائز ملا۔ترجمہ نگاری میں انہیں کولمبیا یونی ورسٹی سے ایوارڈ حاصل ہوا۔'دیس دیس کی کہانیاں' کو ادبِ اطفال کے لیے یونیسکو پرائز ملا۔اس کے علاوہ نیلسن منڈیلا پرائز ۱۹۹۷ء اور پاکستان کے ستارۂ امتیاز سے ۲۰۰۰ء میں کشورناہید سرفراز ہوئیں۔

عملی زندگی سے جڑاؤ کے سبب کشور اپنے تجربات اور مشاہدات کو متنوع رنگوں میں پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ان کی ابتدائی غزلوں میں ایک معصوم لڑکی کا پیکر ابھرتا ہے جو خوابوں کی دنیا میں مگن رہنا چاہتی ہے مگر جس کی نوخیز امنگوں اور خواہشوں پر سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اصولوں کے کڑے پہرے لگے ہوئے ہیں۔اس کے باوجود فطری جذبات اور تجسس اسے چہار دیواری سے باہر پھیلی ہوئی پرکشش فضاؤں روبرو ہونے کے لیے راغب کرتے ہیں۔نسائی نفسیات و کیفیات کی سچی اور نازک تصویریں اپنے خوشنما انداز میں کشور کے اشعار میں نظر آتی ہیں:

Scanned with CamScanner

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

●

صحبتیں خوب ہیں خوش وقتیٔ غم کی خاطر
کوئی ایسا ہو جسے جان وجگر سے چاہوں

●

بدن کا شہر ہے سونا کہو چلا آئے
وہ خواب بن کے مجھے رات بھر جگائے بھی

●

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

●

میں گھر کی روشنی ہوں مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے مئے کدے میں نہ دینا صدا مجھے

●

وہ اجنبی تھا غیر تھا کس نے کہا نہ تھا
دل کو مگر یقین کسی پر ہوا نہ تھا
کچھ یوں ہی زرد زرد سی ناہیدؔ آج تھی
کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

●

گھر کے دھندے تو نپٹتے ہی نہیں ہیں ناہیدؔ
میں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں

●

Scanned with CamScanner

تمہارے شہر کے لڑکوں کو کیا ہوا ناہید
بہت اداس ملے کوئی دل دکھا نہ ملا

●

لیکن پھر کشور ناہید کو خوابوں کی شکستگی کا دکھ جھیلنا پڑتا ہے۔ درد کی آگ میں تپ کر احساس کا سونا کندن بنتا ہے اور جرأتِ اظہار کی توانائی مزید نکھر سنور کر سامنے آتی ہے۔ نت نئے تجربوں سے شناسائی مشاہدے کو دبازت عطا کرتی رومان کی فضاؤں سے آگے نئے آفاق کی جانب ان کی توجہ دلاتی ہے۔ جس کے سبب گھر کی چہار دیواری کی گھٹن سے لے کر سماج کی جبریت اپنی تلخ سچائیوں سمیت ان کی غزلوں میں سمٹ آتی ہیں۔ مرد کی حاکمیت اور بالادستی کے تلے پستی، کراہتی، مجبور، بے بس اور بے توقیر عورت کو جب اپنی ذات میں نہاں بے پناہ توانائی اور اسرار کا گیان ملتا ہے تو کشور ناہید کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے:

بند ہو در تو یہ دیوار گرا ڈالے گا
دل کا سیلاب کناروں سے نکلنا چاہے

●

اے رہِ ہجر نو فروز! دیکھ کہ ہم ٹھہر گئے
یہ بھی نہیں کہ زندہ ہیں یہ بھی نہیں کہ مر گئے
خواب تلک رہائی تھی تیرے فراق و ہجر سے
آنکھ کھلی تو آئینے تہہ میں کہیں اتر گئے

●

ہنستے رہے ہم اداس ہو کر
آنسو بھی گرے تو دل کے اندر
قبروں کو بہن بنانا سیکھیں
بالوں میں نئی رت سجا کر

●

Scanned with CamScanner

شیشے کی فصیل میں مقید

امکاں سے سوا عذاب سوچوں

•

کشور ناہید کی غزلوں کا ایک اہم وصف اس کی رمزیت ہے۔ کم سنی سے لے کر پختہ عمر کی نفسیات و احساسات کے جرأت مندانہ اظہار کے باوجود نفاست، تہہ داری اور گداز سے ان کی غزلیں معمور ہیں۔ ان کی تخلیقی شخصیت میں بغاوت، سرکشی، فرسودہ رواجوں اور روایتی فارمولوں کے جبر سے انکار جیسے عناصر کار فرما ہیں، جس کا اپنی نظموں میں انہوں نے کھل کر اظہار کیا ہے۔ لیکن نظموں کے برعکس غزل کا فن ضبط، سلیقہ، رمز اور اشارے کا طالب ہے، اس روایت کی پاس داری کا احترام ناہید نے خوب کیا ہے۔ اداسی اور شکستگی کے ساتھ ساتھ برہم جذبات و کیفیات کے اظہار میں بھی فنی ضابطوں کا رکھ رکھاؤ ان کی جمالیاتی آگہی اور شعری روایت کے پختہ شعور کا عکاس ہے۔ نسائی زندگی کے تلخیوں بھرے نشیب و فراز ہوں یا عصری مسائل کی سنگینی، سارا تفکر شعری اظہار کے پیکر میں سما گیا ہے۔ کرب ناک صورتِ حال کا سچ صرف شاعرہ کی ذات سے وابستہ نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کی عورت کا درد بن کر سامنے آتا ہے:

یہ کیا خواب تمہارے نکلے اور عذاب ہمارے
چھلکی چھلکی آنکھیں لیکن دل پایاب ہمارے
یہ کیا آدھے چاند پہ رونق آدھے پہ تاریکی
یہ کیا صبحِ تمنا ان کی شب القاب ہمارے
یہ کیا بہتے دریا آنکھیں جلتے صحرا پاؤں
یہ کیا بجھ گئے اب کے دلوں میں بھی مہتاب ہمارے

•

پلٹ کے آئے تو دیوار و در نے حیرت کی
ہمارے ہاتھ میں تحریر تھی ہزیمت کی

Scanned with CamScanner

زباں پہ لفظ کی آہٹ سے ہونٹ جاگے ہیں
یہی تو ایک نشانی تھی خوں کی حدت کی

•

زمیں کی ہم سخنی قسمتِ صبا بھی نہیں
رہیں کہاں کہ یہاں معتبر ہوا بھی نہیں
غم و ملال کے آنگن میں پیر جلتے ہیں
جھلس کے جائیں کہاں کوئے بے ادا بھی نہیں

•

ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کے پھر جڑ جائے گی
دیواریں ہل جائیں پردہ ہٹانے سے

•

ہم اپنے گھر میں پلے سرد مہریوں کے تلے
گھروں سے نکلے تو زہرابِ لب کا ڈیرا تھا

•

تمہیں سے تہمتِ عالم کی نسبتیں موسوم
تمہیں کو کہتے ہیں سب لوگ سب سے اچھی کیوں
مرا وجود بھی گیا کچھ خدا سے ملتا ہے
سوال و شک سے ہے بے گانہ میری ہستی کیوں

وجود کی اسی آگہی کے سبب ناہید کو وہ قوت گویائی حاصل ہوئی جو ان سے پہلے کی شاعرات کے یہاں مفقود ہے۔ ان کی غزلوں میں سنگین روایتی مسئلوں کے درمیان گھری عورت اپنی زندہ اور متحرک ذات کا اثبات چاہتی ہے۔ جو سونے چاندی کی دیواروں اور فریبی رواجوں کی زنجیریں توڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور صدیوں سے چلے آ رہے جابرانہ اور حاکمانہ مرد اساس

Scanned with CamScanner

معاشرے کے بوسیدہ اصولوں سے انکار کرنا جانتی ہے۔ وہ گونگی گڑیا نہیں بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مکالمہ کرنے والی زمین کی نصف آبادی ہے:

سلگتی ریت پہ آنکھیں بھی زیرِ پا رکھنا
نہیں ہے سہل ہوا سے مقابلہ رکھنا

●

دیکھ کے باہر منظر نئے بلاوے کا
میں کھڑکی کو اینٹوں سے چن دیتی ہوں

●

اس کے آنگن میں کھلتا تھا شہرِ مراد کا دروازہ
کنوئیں کے پاس سے خالی گاگر ہاتھ میں لے کر پلٹی میں

●

لمحہ لمحہ جاں پگھلے گی قطرہ قطرہ شب ہو گی
اپنے ہاتھ لرزتے دیکھے اپنے آپ ہی سنبھلی میں

●

اسے یہ زعم کہ آغوشِ گل بھی اس کی ہو
جو چاہتا ہے پرندوں کو بے نوا رکھنا

●

یہ کیسی ضد کہ پلٹتی تھی موج ساحل پر
یہ حوصلے کی نمو تھی کہ بات ڈر کی تھی

●

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے تھے

●

Scanned with CamScanner

عورتوں کے استحصال کے خلاف بین الاقوامی سطح پر مختلف تحریکوں کے چلتے رہنے کے با وجود سچ تو یہ ہے کہ سماجی اور معاشرتی صورتِ حال میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا ہے۔ بھلے ہی علمی ،اقتصادی اور سیاسی منظر نامے پر کچھ نئے رنگ کے گل بوٹے نظر آتے ہیں مگر وہاں بھی صنفِ نازک مہذب انداز میں مرد کی حاکمیت کی تابع ہی ہے۔ ناہید نے عورت کو مقدر کے سہارے جینے کے بجائے مخفی نسائی قوتوں کو ابھار کر خود کاتبِ تقدیر بن جانے راستہ دکھایا ہے۔ مرد اساس استحصالی معاشرے پر طنز کرتے ہوئے ان کے لہجے کی کاٹ توجہ طلب ہے۔

●

ستم شناس ہوں لیکن زباں بریدہ ہوں
میں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں

●

مزاج اس کا مرے آنسوؤں سے ملتا تھا
جھلس گئی ہوں مگر پانیوں کے اندر بھی
ہماری بے گنہی پر ہمارے ہاتھ کٹے
وہ خلعتوں میں سرافراز لے کے خنجر بھی
ہم ایسے دشت نوردوں کو قید رکھنے کو
سلاخیں گاڑ گئے ہیں گھروں کے اندر بھی

●

سبو لیے تشنگی کھڑی تھی ، میں جانتی تھی
کہ جاں فروشوں کو قوسِ شمشیر دیکھتی ہے

●

کشور ناہید کے فکر و اظہار کا تنوع ،غنائی آہنگ سے آراستہ لہجے کی سبک روی ان کے اشعار کی جان ہے۔ ان کی علامت سازی شدتِ احساس اور عام فہم لفظوں کے خوب

Scanned with CamScanner

صورت توازن سے وجود میں آئی ہے۔ ساتھ ہی فارسی تراکیب کا استعمال بھی ان کی ہنرمندی کا مظہر ہے۔ جس کے سبب بوجھل پن کے بجائے تہہ در تہہ معنی کے تلاطم نظر آتے ہیں۔ آئینہ، زنداں، دیوار، پانی، پیاس، سمندر، موج بھنور، صحرا، ریت، سراب، شجر، بیل، پھول، اوس، گھٹا، ہوا، بادل، پرندے اور گھر جیسے تلازموں نے ڈکشن کو خوش نما بنا دیا ہے جو معنی کی طلسمی فضا سے روشناس کراتا ہے:

تمہارے لب تھے کٹورے ہمارے ہونٹ تھے پیاس
وصال تھا کہ تھی تصویرِ تشنگی آخر

•

ہماری عمر تو ہے بیل عشقِ پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا

•

طلب کی پیاس کو پھولوں میں بانٹ دیتا تھا
وہ خواب میں بھی مرے لب پہ اوس رکھتا تھا

•

بھیجی ہے اس نے پھولوں میں منہ بند سیپیاں
انکار بھی عجب ہے بلا وا بھی ہے عجب

•

وہ کھینچ لایا شجر کا گداز آنکھوں میں
گلے ملا تو وہی چھاؤں مختصر کی تھی

•

میں اس کی آنکھ کے زنداں میں کب تلک جاگوں
بھنور نے بھی تو ہواؤں سے رخصتی مانگی

•

Scanned with CamScanner

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں

یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

تاریخی اور تہذیبی جبر و استحصال کے پاٹوں میں پستی ہوئی عورت کی بلند اور توانا آواز کشور ناہید کی شاعری ہے۔صدیوں کے فرسودہ نظام کے خلاف ایک نسائی شخصیت کا یہ باغیانہ تیور اردو غزل میں ایک نوکھا اور خوشنما تجربہ ہے۔ان کی پوری شاعری نسائی وجود کی قوت و اسرار کا صحیفہ ہے جو اپنے ہونے کی گواہی ہر آئینہ گر سے چاہتا ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

نور جہاں ثروتؔ

عہدِ حاضر میں عورتیں عملی زندگی سے زیادہ جڑی ہوئی ہیں۔ان کی تخلیقی کاوشوں میں زندگی کے خارجی اور باطنی دونوں پہلوؤں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ایک عورت کے لیے غزلوں میں باہری دنیا کے تجربوں کے ساتھ ساتھ اپنے جذبوں کو بھی زبان دینے کا عمل کتنا مشکل ہوگا اسے بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔کیوں کہ غزل تو ریشم کاتنے کا فن ہے کہ دھاگے میں نزاکت اور ملائمیت ماہر انگلیاں ہی بھر سکتی ہیں۔نور جہاں ثروتؔ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صحافی بھی تھیں۔عملی زندگی کا قوی مشاہدہ اور اس کے نشیب و فراز کے تجربے میں ان کی شرکت تھی۔ان کا ایک شعری مجموعہ'بے نام شجر' ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔چوں کہ شاعرہ کم گو تھیں اس لیے ان کے مجموعہ کو مختصر کہا جاسکتا ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ۱۷ اپریل ۲۰۱۰ء کو لگ بھگ ساٹھ برس کی عمر میں دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔نور جہاں ثروتؔ کی شاعری ایک باشعور اور بالغ نظر نسائی شخصیت کا فکری اظہار ہے۔

عہدِ موجود میں زندگی بے یقینی ، بے اعتباری، خوف ، بے بسی، مکر و فریب، تہذیبی قدروں کے زوال اور رشتوں کے انحطاط سے عبارت ہے۔انہی عناصر سے نور جہاں ثروتؔ کی غزلوں کا منظرنامہ تیار ہوا ہے۔کمال یہ ہے کہ مسائل سے نبرد آزما ہونے کے باوجود انفعالی جذبوں کو شاعرہ خود پر حاوی نہیں ہونے دیتیں بلکہ جبر و استحصال کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرتی ہیں۔سفاک حقیقتوں کو جمالیاتی احساس اور تخلیقی فکر سے ہم آہنگ کر کے وہ اشعار کی صورت گری کرتی ہیں:

اب نہ رشتوں میں حرارت نہ صداقت کوئی
زندگی کہئے کہ ہے خود سے بغاوت کوئی

Scanned with CamScanner

●

گلیوں میں اس کی کچھ نہ ملا کرب کے سوا
اب آرزو کا شہر بدلنا پڑا مجھے

●

ساتھ میرے اپنے سائے کے سوا کوئی نہ تھا
اجنبی تھے سب جہاں میں آشنا کوئی نہ تھا
سارے رشتے ریت کی دیوار تھے موسم کے پھول
بات کا سچا یہاں دل کا کھرا کوئی نہ تھا

●

کدورتیں تھیں غضب کی کہ منہ چھپانا پڑا
وہ شہرِ دوست تھا لیکن پلٹ کے آنا پڑا

●

جس دشتِ بے شجر میں جنوں مجھ کو لے گیا
امید کے بھی سائے سے ڈرنا پڑا مجھے

نور جہاں ثروت نے ان اشعار میں زندگی کی جو سچی تصویریں کی ہیں ان سے کون ناواقف ہے؟ کہ معاشرتی جبر جسے سماجی، اقتصادی اور سیاسی سطح پر جھیلنا ہر ذی ہوش کا مقدر ٹھہرا ہے۔ جس کے نتیجے میں خلوص، اپنا پن اور شناسائی کے بجائے آج اجنبیت، بے گانگی اور بے حسی کا راج ہے، اس سے مفر کہاں؟ لیکن فنکار پر تو بہتر معاشرے کی تخلیق، تشکیل اور تعمیر کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے، وہ زندگی کی اعلا قدروں کی بازیافت بھی کرتا ہے کیوں کہ اپنی فطری حساسیت کی بدولت وہ کشادہ دل اور انسان دوست بھی ہوتا ہے۔ یوں تخلیق کار کی دردمندانہ شخصیت دوسروں کے درد میں شریک ہو کر اس کا مرہم بن جاتی ہے۔ اور اپنی تخلیق کے ذریعے ہر حساس فن کاران تجربوں کو وجود عطا کرتا ہے جسے وہ زندگی کا حاصل جانتا، سمجھتا ہے۔ ثروت کی غزلیں اس احساس وفکر سے معمور ہیں:

مجھی پہ ختم ہوئیں دوست داریاں ساری
کہ میرے درد کا دامن بہت کشادہ تھا

Scanned with CamScanner

●

ہمارے پاس تو لے دے کے ہے یہ درد کی دولت
بڑے آرام سے اپنی گزر اوقات ہوتی ہے

●

اپنی تپش میں آپ جھلسنا تو فرض تھا
اکثر پرائی آگ میں جلنا پڑا مجھے

●

درد کی یہی دولت کو زندگی کا سرمایہ جان کر شانوں پر اٹھائے ہوئے ثروت اپنا سفر طے کرتی ہیں۔ اس عہدِ ریاکاری میں وہ سر بلند ہو کر جینے کا ہنر جانتی ہیں۔ جب وقت کی تیز دھوپ جسم و جاں کو جھلسانے لگتی ہے تو 'بے نام شجر' کی چھاؤں میں دو گھڑی تھکن اتارنے اور تازہ دم ہونے کی خاطر ٹھہر جاتی ہیں۔ شاعرہ کے یہاں شجر علامت ہے قوتِ نمو کی، آرزو اور خواب کی، پناہ گاہ ہے معصوم اور بے زبان پرندوں کی، اشارہ یہ ہے بہار و خزاں کے موسم کا، زندگی کی بدلتی رتوں کا، اپنی زمین اور اس کی گہری پھیلتی جڑوں سے وابستگی کا۔ اسی شجر کے سائے میں رک کر ثروت اپنی پلکوں سے گردِ سفر پوچھتی ہیں۔ تلووں سے صعوبتوں کے کانٹے چنتی ہیں۔ اور یادوں کے اوراق پلٹتی ہیں۔ یادیں جو گریز پا لمحوں کی بازیافت ہیں، معصوم اور لطیف ہیں، تنہائی کی غم گسار ہیں، جن میں تڑپ بھی ہے اور دبی دبی کسک بھی:

تمام عمر کا حاصل جسے میں سمجھی تھی
گزر گیا وہی لمحہ اداس کر کے مجھے
وہ اک لطیف سا جھونکا متاعِ جاں ثروت
چلا گیا ہے کدھر خوش لباس کر کے مجھے

●

میرے افکار کے ہم زاد رہا کرتے ہیں
کتنا آباد مرا گوشۂ تنہائی ہے

Scanned with CamScanner

عکس تا عکس بدل سکتی ہوں چہرہ میں بھی
میرا ماضی مگر آئینہ دکھاتا ہے مجھے

●

قربتوں کی آنچ میں جلنے سے کچھ حاصل نہ تھا
کیسے کیسے لطف اب یہ فاصلہ دینے لگا

●

جو سلسلے رشتوں کے تھے سب ٹوٹ چکے ہیں
بس یادوں کے محراب پہ زنجیر سجی ہے

●

ان ہی یادوں نے ثروت کا رشتہ تہذیبی شعور اور عصری آگہی سے جوڑے رکھا ہے۔ ان کی شاعری دل کے زخموں کی کائنات بھی ہے اور شعور وادراک کی تجرباتی کی دنیا بھی۔ انہیں ذاتی تجربے کو کائناتی وسعت بخشنے کا ہنر خوب معلوم ہے۔ ان کے سچے تجربے روزمرہ کی زندگی سے حاصل کردہ ہیں۔ اس لیے ان کے اشعار عصری حقیقتوں کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ جن میں عہد حاضر کے نشیب وفراز اور مسائل سے برسرپیکار انسانی وجود صاف نظر آتا ہے۔ ثروت کا جمالیاتی شعور انہیں شاعری کے دامن میں سمیٹ لیتا ہے:

پیاس جو بجھ نہ سکی اس کی نشانی ہوگی
ریت پر لکھی ہوئی میری کہانی ہوگی

●

جس سمت بھی جاؤں میں بکھر جانے کا ڈر ہے
اس خوف مسلسل سے مجھے کوئی نکالے

●

دست بستہ سب کھڑے رہتے ہیں اس کے رہ برو
کس میں ہمت ہے جو کرلے قہر سامانوں سے بات

Scanned with CamScanner

طے کرو اپنا سفر تنہائیوں کی چھاؤں میں
بھیڑ میں کوئی تمہیں کیوں راستہ دینے لگا

●

ہم اپنے غم کا بوجھ تو خود ہی اٹھائیں گے
اس شہرِ خوش سواد میں ہم راز کون ہے

●

تیشے مژہ کے نہر بہائیں گے نور کی
آنکھوں میں چھپے ہیں وہ منظر تراشئے

●

گردشِ روز وشب کی روح فرسا جبریت کے خلاف ان کی آواز بلند آہنگ یا جارحانہ نہیں بلکہ شائستگی کے ساتھ سر اٹھائے، اپنے وجود کے اثبات کا اصرار کرتی گفتگو کا سا انداز ہے۔ بناوٹ سے دور سادہ اور کھرے لہجے میں وہ ٹیس اور کسک ضرور ہے جو دل میں چبھ جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں نسائی رومانی احساس کی تصویریں بھی ہیں لیکن اس میں بھی بڑی وسعت ہے۔ وہ کسی نوعمر لڑکی کے جذباتی ردِ عمل کے بجائے ایک باشعور اور دیدہ ور نسائی فکر کی عکاس ہیں۔ آج کی زندگی میں جب عشق کے معنی بدل گئے ہیں تو ہجر و وصال کا رنگ بھی الگ ہونا لازمی ہے۔ اب نسائی ذہن محبوب کی آرزو میں جاں گھلانے، محافظ سمجھنے اور سہارا چاہنے کے بجائے اپنے بل پر زندہ رہنے کی جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ تیز رفتار زندگی کے دور میں گرتے ہوئے تہذیبی اقدار اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے درمیان جیتے ہوئے نور جہاں ثروت زندگی ہارتی نہیں یا غم زدہ نہیں ہوتیں بلکہ وقت کی بدلتی چال کے مطابق خود اپنی سوچ کے زاوئے بدلتی ہیں۔ تنہا عورت کس فخر سے اپنے احساس وفکر کو پیش کرتی ہے۔ نمونہ دیکھیے:

ہم نے وفا نبھائی بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنے ہی بل پہ زندہ رہے عمر کٹ گئی

●

Scanned with CamScanner

عمر بھر دیکھا ہوا وہ آرزو کا خواب تھا
کتنی آسودہ ہوئی ہوں اپنے ہی انکار سے

●

نسبت ہی کسی سے ہے نہ رکھتے ہیں حوالے
ہاں ہم نے جلا ڈالے ہیں رشتوں کے قبالے

●

کوئی روانہ ہوا نذرِ یاس کر کے مجھے
اکیلا چھوڑ گیا ہے اداس کر کے مجھے

●

اک عمر سے میں ذات کے محبس میں بند ہوں
اب وقت کہہ رہا ہے کوئی در تراشئے

●

ہر ایک دور میں سچ کہہ کے سنگسار ہوئے
ہمارے حق میں زمانے کا فیصلہ کب تھا

●

ایسا نہیں کہ انہوں نے آرزوؤں کا خواب نہیں دیکھا تھا یا ان کے دل کی وادی عشقیہ جذبوں کی رتوں سے ناآشنا تھی۔ بلکہ انسان کے اس فطری احساسات و کیفیات کے مختلف رنگ ان کے یہاں بھی موجود ہیں مگر نارسائی کی گرد اور ملال کی دھند میں لپٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بھلا حسن و عشق کی ہوش ربائی اور کرشمہ سازی سے انسان کہاں بچ سکتا ہے۔ رومانی فکر کے چند اشعار درج ہیں:

تمہارے نام کی مالا جپی ہے
ہماری چاہتوں کا پوچھنا کیا

●

Scanned with CamScanner

ایک بھی دیپ نہ یادوں کے بجھانے دے گا
میری آنکھوں کو وہی خواب پرانے دے گا

●

رفاقتوں نے دیے ہیں مجھ کو عداوتوں کے عذاب سارے
مرے ہی دل پر ہوئے ہیں نازل محبتوں کے عذاب سارے
وہ خوشبوؤں کا لباس پہنے ملا کچھ ایسے کہ ایک پل میں
پڑے ہوئے تھے جو جسم و جاں پر اتر گئے وہ نقاب سارے
سوال سادہ سا زندگی سے کیا تھا ہم نے بھی ایک ثروت
وہ پتھروں کی ہوئی ہے بارش کہ مل گئے ہیں جواب سارے

●

تنہائیوں کی برف پگھلتی نہیں ہنوز
وعدوں کے اعتبار کی بھی دھوپ چھٹ گئی
ثروت ہر ایک رت میں لپیٹے رہے جسے
وہ نامراد آس کی چادر بھی پھٹ گئی

●

اوروں پہ اثر کیا ہوا اس ہوش ربا کا
بس اتنی خبر ہے مرا ایمان گیا ہے
رہنے لگا دل اس کے تصور سے گریزاں
وحشی ہے مگر میرا کہا مان گیا ہے

●

احتیاطیں تھیں مناسب جب سماعت تھی بجا
اب تو اپنے دل کی سب کہنے لگے دیوار سے

●

Scanned with CamScanner

مجموعی اعتبار سے نور جہاں ثروتؔ کی غزلیں تہذیبی قدروں بالخصوص انسانی رشتوں کے شکست وریخت کا جمالیاتی اظہار ہیں۔ان کے اشعار میں زخمی روح کی سرگوشیاں ہیں۔انہوں نے اپنے اطراف اور اپنی زندگی میں رونما ہونے والے ستم و جبر کو غنائی اور مترنم لہجے میں پیش کیا ہے۔وہ غزل کی رمزیت، وسعت اور پراسرار سمتوں سے خوب واقف ہیں اس لیے ان کی غزلیں باطنی کیف اور فکری جہت کی ہم آہنگی کا خوب صورت امتزاج بن گئی ہیں۔شجر کا رمزیہ پیکر کہیں شادابی، کہیں اداسی، کہیں تنہائی اور کہیں یادوں کا گھنا سایہ بن کر جلوہ دکھا رہا ہے۔بہر کیف ثروت کی غزلیں جدید نسائی فکر کا دلاویز نمونہ ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

آسما سعیدی

آسما سعیدی مشہور شاعر بسمل سعیدی کی صاحب زادی ہیں۔ جن کا تعلق ٹونک (راجستھان) کے ایک ذی علم اور معزز سید خاندان سے ہے۔ اس اعتبار سے فنِ شاعری آسما نے ورثے میں پائی ہے۔ 'گل ہائے فکر' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ اس میں ایک حمد، دو نعت اور ایک منقبت کے علاوہ ایک سو پندرہ غزلیں، ستر نظمیں، چار رباعیات کے ساتھ کچھ قطعات بھی شامل ہیں۔ موصوفہ نے ہائی اسکول سے بی۔ اے، بی۔ ایڈ تک کی تعلیم علی گڑھ میں پائی۔ مگر بہ سبب علالت دہلی اپنے گھر لوٹ آئیں۔ بعد میں دہلی یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ لیکن علی گڑھ میں مقیم چھوٹے بھائی محبوب سعیدی کی تنہائی کے خیال سے اپنے والد جناب بسمل سعیدی کے حکم پر پھر علی گڑھ واپس آ گئیں اور یہیں سے ڈاکٹر خورشید الاسلام کی نگرانی میں منقبت علی خاں حسرت عظیم آبادی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔

'گل ہائے فکر' آسما سعیدی کی تخلیقی جذباتیت کا عکاس ہے۔ جذبات خالص عشقیہ رنگوں سے شرابور تو ضرور ہیں مگر سطحی یا فرسودہ نہیں۔ کہیں کہیں سوادِ عشق میں تفکر کی پرچھائیاں بھی ڈولتی نظر آتی ہیں مگر یہ فلسفیانہ روپ نہیں لے پاتیں۔ ان کی غزلوں سے بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اردو شاعری کی طویل روایت کا پختہ شعور ہی نہیں بلکہ اردو غزل کی جمالیاتی جہت کی آگہی بھی ہے۔ داخلی صنفِ سخن ہونے کے سبب آسما کی غزلیں بھی ان کی شخصیت کی باطنی کیفیات و احساسات کی ترجمان ہیں۔ معاملاتِ حسن و عشق کے بیان میں ان کے اشعار میں کہیں کہیں اختر شیرانی کی رومانیت کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ آسما بھی اسی دیار کی ہیں جہاں کے اختر تھے۔ گو کہ دونوں کے درمیان عصری فاصلے حائل تھے لیکن ذوق و شوق کی موجیں تو

Scanned with CamScanner

صدیوں کی مسافت طئے کر لیتی ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے یہ اشعار ہیں:

تمہارے نغمۂ دلکش کی گونج ہے اب تک
تمہیں ندی کے کنارے تلاش کرتے ہیں

●

دمِ گلگشت ترے ساتھ جو گزری تھی کبھی
پھر اسی صبح، اسی شام کو دل ڈھونڈتا ہے

●

ایسا اک کیف بھی ہے دل میں کہ جس کے آگے
شام کی مست ہوا، بادِ سحر کچھ بھی نہیں

●

حسیں لمحات گزرے تھے کبھی جن کے کناروں پر
انہیں چشموں کی یہ شیریں صدائیں یاد کرتی ہیں
نگاہیں بن کے جو تم پر کبھی قربان ہوتی تھیں
تمہیں آسما کے دل کی وہ دعائیں یاد کرتی ہیں

●

آسما سعیدی کی شعرگوئی کا محور جذبۂ عشق ہے اور تجرباتِ عشق کے مختلف مرحلوں کی پیش کش میں شاعرہ کامیاب ہیں۔ کیوں کہ ان کی شاعری کا سبب بھی زندگی اور کائنات کی یہی آفاقی صداقت ہے۔ خود کہتی ہیں:

ہمارے واسطے جو کچھ بھی ہے محبت ہے
یہی ہے موت یہی زندگی ہمارے لیے

●

کسی کی یاد نے لی تھی بس ایک انگڑائی
ہزار شعر کے مضمون آئے جاتے ہیں

Scanned with CamScanner

کھلا جاتا ہے کتنا غنچۂ دل
تصور میں کوئی آیا ہوا ہے

●

اسما سعیدی کی پوری شاعری اسی محبت سے عبارت ہے جوان کے لیے زندگی کا سرشار نغمہ بھی ہے اور موت کا دل گرفتہ نوحہ بھی۔ جب محبوب کی خوش رنگ یادیں شاعرہ کو اپنے حصار میں لیتی ہیں تو بڑے طرب ناک اور گہرے رومانی جذبوں کی رعنائی اشعار میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر یادوں کے چمن زاروں میں کھلنے والے نازک غنچوں پر بہار آجاتی ہے۔ کیف و سرور کی فضا میں شوخ جذبوں کی دھنک سے دل فریب رنگوں کا سماں بندھ جانا قابل دید ہے۔ ان رنگوں کا عکس ان اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

وا ہیں دریچے کب سے گلستانِ شوق کے
مانند بوئے گل وہ خراماں کب آئے گا

●

خمار آگیں نگاہوں کی ہے اک صورت تصور میں
خوشا اے فرصتِ نظارگی مدہوش رہنے دے

●

پنہاں نظر میں اپنی وہ جلوہ ہے آج بھی
روحِ بہار و خلدِ نظارہ کہیں جسے

●

کبھی خموش کبھی سامنے ہیں محوِ کلام
تصورات پہ پھر آپ چھا رہے ہیں یہاں

●

کبھی نظارۂ صبحِ حسیں ہے شام سے بڑھ کر
کبھی شام حسیں عشرت بہ داماں ہے جہاں وہ ہیں

Scanned with CamScanner

درج بالا اشعار رومانی کیف سے بھرپور ہیں۔ان ہی مقام پر آسماسعیدی کی شاعری پر اختر شیرانی کا عکس جھلملاتا نظر آتا ہے۔محبوب کی قربت کا لطف وسرور اور جذبہ واحساس کی فسوں کاری کوشاعرہ اس کمالِ احتیاط سے شعر میں پروتی ہیں کہ نہ نسوانی شخصیت پر آنچ آتی ہے اور نہ ہی فن پر۔ حالاں کہ یہ خالص عشق کے مسرور اور مدہوش کرنے والے لمحوں کا عکس ہوتا ہے۔چند اشعار اور دیکھیں:

ہمارا چاند کسی کا تصورِ رنگیں
کسی کی آرزوئے دید چاندنی اپنی

●

یوں اٹھی وہ نگاہِ ناز ادھر
جیسے نغمہ سنا دیا آکر

●

کس سے سیکھی یہ ادا غنچوں نے
کس کا اندازِ ناز دیکھا ہے

●

خود بھی شاید نہ پا سکو گے تم
ہم نے جو بات تم میں پائی ہے

●

لیکن ہجر کے طویل لمحات سے ان خواب خواب کیفیتوں کا سحر ٹوٹ جاتا ہے۔نارسائی کا احساس شاعرہ کو دکھ کی ردا سے ڈھانپ دیتا ہے۔اور ایسے میں شاعرہ فگار جذبوں کے ساتھ دل کی کرچیاں سمیٹنے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں۔یاسیت کے بادل گھرے ہوتے جاتے ہیں۔تب دید کی تڑپ اور جدائیوں کی کسک کا بیان نم ناک لہجے میں ہوتا ہے۔مثلاً:

مسکراہٹ تھی ابتدا جس کی
اشک آخر ہے اس فسانے کا

Scanned with CamScanner

●

سمجھ رہے تھے جسے ابتدا میں وجہِ حیات
وہی سرورِ غمِ عشق اب عذاب ہوا

●

چراغِ زندگی گل ہو گیا ہے
نظر سے دور جب سے وہ گیا ہے
بھرے گھر کا یہ عالم ہے کہ تجھ بن
عجب اک ہو کا عالم ہو گیا ہے

●

کسی میں تاب کہاں تھی کہ ہم سفر ہوتا
رہِ حیات میں ہیں صرف ہم سفر آنسو

●

شعر جس چیز کا ہے نام اسما
وہ بھی اک دل کی آہ ہوتی ہے
تیرہ بختوں کے روزِ روشن کی
روشنی بھی سیاہ ہوتی ہے

●

یاد آ گیا جو دل تو ہوئی آنکھ خوں چکاں
اجڑے ہوئے کہیں در و دیوار دیکھ کر

●

طوفانِ غم سے بیٹھ نہ اے دل سنبھل ذرا
ہم کو بہت سے کام ہیں اور تو نڈھال ہے

●

Scanned with CamScanner

دل ہے آتش کدہ محبت میں
اب طبیعت میں اعتدال کہاں

●

دل کی ویرانیاں خدا کی پناہ
چاند مدھم ہے آسماں خاموش

یہی بہت سے کام کے تقاضے یاس اور محرومی کے تاریک لمحوں میں بھی آسما کونڈھال نہیں ہونے دیتے۔ آنسوؤں کی ہم سفری میں وہ عشق کی اگلی منزلوں کی طرف گام زن رہتی ہیں۔ پھر ذات کے حصار سے باہر کی دنیا انہیں نئی سوچ عطا کرتی ہے۔ پھر ان کے اشعار میں عشق کائنات کا مرکز بن کر ابھرتا ہے۔ اسلامی نظریات اور نظام حیات پر گہرے ایمان اور ایقان کے سبب مذہبی تفکر کی موجیں شاعری میں رواں نظر آتی ہیں۔ فلسفیانہ سوچ پر کہیں کہیں اقبال کا رنگ جھلک مارتا ہے:

عقل کی سو مسافتیں عقل کا ایک ہی قدم
فاصلہ فرش و عرش کا دل کا ایک گام ہے
موج تجلیات سے نور ہی نور ہے ہر طرف
کس کے فروغ حسن سے آج ضیائے عام ہے

●

بغیر عشق میسر ہوئی نہ تابش دل
اک آفتاب کے پرتو سے آفتاب ہوا

●

وہ نام جس نے مسخر کیے تھے کون و مکاں
دلوں کے واسطے اب بھی وہ اسم اعظم ہے

●

ایمان و رسالت، عرش و فرش، الطاف و ترحم ربطِ دل
ہے ایک محبت یہ جس کے عنوان بدلتے رہتے ہیں

Scanned with CamScanner

ہر لمحۂ فنا میں ہے صورِ ابد کا شور
ہنگامہ دیکھ ہستیِ ناپائیدار کا
ہمیں سے ہے نمودِ ہر دو عالم
ہمارے سامنے یہ بحر و بر کیا

●

تکوینِ کائنات کا باعث امینِ عشق
یہ ناتواں سا آدمی سایہ کہیں جسے

●

بہ شکل بحر و دریا قطرے ملتے ہیں بہت ہم دم
لباسِ قطرہ میں لیکن کوئی دریا نہیں ملتا

●

معتبر غم نہ عیش دنیا میں
رنگ دیکھا بہت زمانے کا

عشق کی یہ سربلندی، جذبہ واحساس کی نیرنگی، انسانی عظمت کا شعور اور زندگی کا سوز و گداز آسما سعیدی کی غزلوں کا قابل قدر حسن اور ان کی باطنی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ گوکہ ان کے یہاں نسائی فطرت کا اظہار نہیں ملتا لیکن تہذیب و شائستگی کے ساتھ قصہ، جاں کی پیش کش طویل شعری روایت سے آگہی کا مظہر ہیں۔ نغمگی اور آہنگ سے بھرپور رواں غزلیں ان کے فنی شعور کی عکاس ہیں۔ بیش تر غزلوں کی طوالت پر غزل مسلسل کا گماں گزرتا ہے۔ ایک غزل ۱۳۱ اشعار کی بھی ہے تو ایک میں ۱۲۹ اشعار ہیں۔ ۱۲۶ اشعار کی غزل بھی ہے تو ۲۳ اور ۱۲۲ اشعار کی کئی غزلیں بھی ہیں ان کی قادرالکلامی کی مثال ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آسما سعیدی کی قوتِ متخیلہ حوصلے اور زندگی سے بھرپور ہے۔ باوجود طبعاً رومانی ہونے کے حالات کی تبدیلی کا ادراک انہیں زمینی حقیقت سے روبرو کراتا ہے۔ ایسے اشعار بھی ان کی غزلوں میں موجود ہیں جن میں زمانہ کے اتار چڑھاؤ اور عصری صورت کی جھلکیاں ملتی ہیں مثلاً

Scanned with CamScanner

یہ سیاست کا کرشمہ یہ فسونِ زرگری
ہیں ارادے اور کچھ لفظ و بیاں کچھ اور ہے

●

یہ ایک وقت ہے جس کو زمانہ کہتے ہیں
کبھی ہمارے لیے ہے کبھی تمہارے لیے

●

نہیں ہے اس زمانے میں مروت
زمانہ اپنا سب دیکھا ہوا ہے

●

کسی کی کج نگاہی کا گلہ کیا
زمانے کی یہی فطرت ہے خو ہے

●

ہم اور ٹھہر جائیں سرِ جادۂ منزل
رفتار زمانے کی ذرا دیکھ رہے ہیں

●

بہت خلوص سے ہم تو بڑھے تھے تیری طرف
زمانے تجھ میں ہی کچھ ہم نے برہمی پائی

●

زندگی اور زمانے کا یہ شعور ان کے بیدار ذہن اور حساس تخلیقی شخصیت کا ترجمان ہے۔

آسما سعیدی کی غزلیں گو کہ ان کی شدید داخلیت کا آئینہ ہیں باوجود اس کے عصری ماحول کی جھلک ننھے منے روزنوں سے دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے 'گل ہائے فکر' شاعرہ کی قادرالکلامی اور تخلیقی جمالیاتی شعور کی گراں قدر مثال ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

شائستہ یوسف

شائستہ یوسف جدید اردو شاعری میں نمایاں مقام کی حامل ہیں ۔ان کی پیدائش ۱۵رجون ۱۹۵۱ء میں بمبئی میں ہوئی۔ والد کا نام سید عبدالرحمٰن اور والدہ کا قمر النسا عرف عابدہ بیگم تھا۔شائستہ نے فلسفہ میں ایم، اے ممبئی یونی ورسٹی سے اور پھر اردو میں بنگلور یونی ورسٹی سے کیا ہے۔جنوری ۲۰۱۴ء میں تمکور یونی ورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ دوشعری مجموعے اول ''گلِ خودرو'' (۱۹۸۵ء) اور دوئم ''سونی پرچھائیاں'' (۲۰۰۸ء) ان کی تخلیقی شخصیت کی شناخت ہیں۔کرناٹک اردو اکیڈمی نے ۱۹۸۶ء میں ''گلِ خودرو'' کو ایوارڈ دیا۔ بعدازیں اسی اکیڈمی نے ۲۰۱۰ء میں بہترین اردو شاعری کے لیے بھی ایوارڈ دے کران کی خدمات کا اعتراف کیا۔شائستہ یوسف کی فعال شخصیت اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ملکی اور بین الملکی سطح پر سرگرم عمل ہے۔ جس کا ثبوت وہ ساری انجمنیں ہیں جس کی وہ اہم رکن ہیں۔' آل انڈیا اردو منچ' اور 'محفلِ نساء کی وہ صدر بھی ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر کئی کانفرنس کا انعقاد بھی کر چکی ہیں جن میں سعادت حسن منٹو اور اختر الایمان پر سیمینار قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی کے ایڈوائزری بورڈ' این، سی، پی، یو، ال کے ایڈوائزری بورڈ اور پر سار بھارتی کی بھی ممبر ہیں۔ان کی صحافیانہ تحرک کی مثال ''اختلاف ویکلی'' (۲۰۰۰ء)، ''نیا ادب'' (۲۰۱۲ء) اور ''میراث'' (۲۰۱۳ء) کی کامیاب ادارت ہے۔

شائستہ یوسف کے تخلیقی عمل کے دائرے میں شاعری کی دو مشہور اصناف یعنی نظم اور غزل کی درخشانی ہے۔''گلِ خودرو'' میں ۱۰رغزلیں اور ۲۵رمتفرق اشعار ہیں۔ جب کہ ''سونی پر چھائیاں'' میں ۵۶رغزلیں اور ۱۲۵رمتفرق اشعار ہیں۔نظم بیانیہ صنفِ سخن ہے جب کہ غزل داخلی

Scanned with CamScanner

صنفِ شاعری ہونے کے سبب اپنی رمزیت اور ایمائیت کے لیے مشہور ہے۔ بیسویں صدی کے اختتام سے قبل جدید اردو شاعری میں ان کا نام خوب صورت اور بلیغ نظموں کی شاعرہ کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔ میرے پیشِ نظر ان کی غزلیں ہیں جو ان کے نسائی شعور و ادراک کا دلکش اظہار ہیں۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں نوعمر لڑکیوں والے خوش رنگ جذبے لرزتے کانپتے ملتے ہیں جنہیں شاعرہ نے فطری امنگوں اور تہذیبی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثلاً:

کون تیرے سوا بتائے گا
میرے چہرے پہ کیسی لالی ہے

●

ہونٹ لرزے آنکھ بھر آئی مری
تم بھی شامل ہو مری بارات میں

●

تو مرے دل کے دھڑکنے کی صدا لگتا ہے
روز ملتی ہوں مگر روز نیا لگتا ہے

●

دودھ بہہ جائے ابل کر کبھی برتن چھوٹیں
اور کب تک ترے بارے میں مسلسل سوچیں
کب تلک گھر کے حسابات میں الجھیں دونوں
آؤ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلیں

●

ہاتھ میں دھر لیا تھا انگارہ
تجربہ یہ بھی پہلا پہلا تھا

●

کیا سنا کیا کہا خبر ہی نہیں
بات بے بات بولتے تھے ہم

Scanned with CamScanner

یہ اشعار محض رومانی تصورات پر مبنی نہیں بلکہ نسائی زندگی کے سچے اور نزاکت سے لب ریز تجربے ہیں۔ان ہی تھرتھراتے پنکھ جوڑتے رنگین تتلیوں جیسے جذبوں کا شاعرانہ اظہار اردو کی شعری روایت میں بابِ نسواں کے قیام اور اضافہ کا سبب بنا۔شائستہ یوسف کی تخلیقی فکر وقت کی رفتار کے ساتھ بالیدہ ہوتی گئی۔صدیوں سے مرد کے تابع سماج اور تہذیبی معاشرے میں نسائی وجود (جو اس دنیا کی نصف آبادی بھی ہے) کی کرب ناک حالتِ زار پر تخلیق کار عورتوں نے اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات کی پیش کش کے لیے مختلف نثری اور شعری اصناف کو ذریعۂ اظہار بنایا۔اردو غزل کی وادیوں میں بھی شاعرات نے اپنے جذبات و تجربات کے انوکھے اور رنگ برنگے پھولوں سے منفرد نسائی خطوں کی تشکیل کی۔شائستہ یوسف کی غزلوں میں نسائی وجود کی شناخت کی چاہ اور تڑپ یوں پیش ہوئی ہے:

مدتوں سے مری تصویر جکڑ رکھی ہے
میری خواہش ہے کہ شیشے کی یہ دیوار گرے

شیشے کی یہ دیوار دراصل صدیوں سے رائج سماجی، معاشرتی اور تہذیبی جبر ہے جس میں عورت کا وجود بے جان سی تصویر کی طرح ہے کہ اس کے لبوں پر مہرِ سکوت لگا ہوا ہے۔وہ اپنی سوچ، اپنی خواہش اور اپنے خواب سے بھی محروم رکھی گئی ہے۔مذکورہ شعر میں محکومی، بے بسی اور لاچاری کے فرسودہ منظر نامہ کو بدلنے کی خواہش کا دلکش اور مہذب اظہار ہے۔احتجاج کی یہ سنجیدہ اور متین آواز ہے جو شاعرہ کے اجتماعی شعور اور جمالیاتی ادراک کا اشاریہ ہے۔کیوں کہ مرد اساس معاشرے کے جبر کی زنجیروں میں کسمساتی زخم زخم عورت تہذیبی استحصال کی دردناک تصویر ہے۔شائستہ یوسف ان ہی ناانصافیوں کو اپنے اشعار کا موضوع بناتی ہیں۔صنفی مساوات کی چاہت اور عورت کے ایک مکمل زندہ وجود ہونے کا اصرار ان کے اشعار میں نمایاں ہے:

●

بس وہی لمحہ آنکھ دیکھے گی
جس پہ لکھا ہوا ہو نام اپنا

Scanned with CamScanner

چاہتی ہوں فلک کو چھو لینا
جانتی ہوں مگر مقام اپنا
کیا یہی ہے شناخت شائستہ
ماں نے جو رکھ دیا تھا نام اپنا

●

تو نے ورثے میں کیا دیا مجھ کو
پتے پتے پہ نام تیرا ہے

●

مجھ کو مٹی نہیں بتا پائی
کون سی رت بہار لاتی ہے

●

دل سے اکثر سوال کرتی ہوں
کیوں میں لمحوں میں جیتی مرتی ہوں
اپنے سائے سے پاؤں چھٹکارا
روز ایسی دعائیں کرتی ہوں

●

نہ زمیں ہے نہ آسماں کوئی
یہ حقیقت بھی کتنی کڑوی ہے

اکیسویں صدی میں بھی ایک بڑا نسائی طبقہ ازلی محرومی اور نابرابری کی گرفت میں ہے۔ جہاں یہ آرزو ایک کراہ کی صورت ابھرتی ہے کہ وقت کا کوئی لمحہ اس کے نام کا بھی ہو، آسمان چھونے کی خواہش رکھنے پر بھی پیشِ نظر وہی مقام رہتا ہے جس کا تعین سماج اور معاشرے نے صدیوں سے کر رکھا ہے۔ جو بہار کے موسم سے نا آشنا ہے کہ سوچ کے شجر کب سرسبز ہوتے ہیں کہ پاؤں کے نیچے زمین بھی دوسرے کی ہے اور سر پہ تنا آسمان بھی مستعار ہے۔ گویا عورت کی اپنی کوئی پہچان کوئی شناخت ہی نہیں۔ وراثت میں بھی یہی بے چہرگی ملتی ہے۔ نسائی زندگی کی اسی کڑوی سچائی کو

Scanned with CamScanner

شائستہ یوسف نے اشعار کے کینوس پر پیش کیا ہے۔ جب وجود کی بے قدری کا کرب سانسوں کو گھاؤ بخشے تو قطرہ قطرہ رستا نارسائی کا دکھ دل کے اندر جگہ بنا لیتا ہے اور پھر خموشی گفتگو بن جاتی ہے۔ ایک انت ہین تنہائی پاؤں پسارے پورے وجود پر محیط ہو جاتی ہے تو ایسے اشعار میں ڈھل جاتی ہے:

کوئی سایہ بھی صدا کا نہیں آہٹ تو کجا
صرف سناٹا ہر اک سمت بلاتا ہے مجھے

●

بنتی ہیں مکڑیاں نئے جالے ہر ایک شام
دن سارا بیت جاتا ہے گھر کی صفائی میں

●

اک نیا خواب دیکھنے کے لیے
اپنی آنکھوں کو بند کرتی ہوں

●

میری تنہائیاں بتائیں گی
خالی کمروں میں کون رہتا ہے

●

ذہن میں آہنی دریچے ہیں
خواب شیشے کے ہم سجاتے ہیں

●

میں اکیلی کھڑی ہوں کب سے یہاں
تم تو ساری دشائیں بھول گئے

اور پھر تنہائیوں میں زندگی کا کرب ناک منظر نامہ ابھرتا ہے۔ جس میں نارسائی کی ٹیس شگوفوں کی صورت مہکتی ہے۔۔ اپنے بے چہرہ اور تاریخ و تہذیب کے اوراق پر اجنبی ہونے کی کسک کچھ اس طرح سامنے آتی ہے:

Scanned with CamScanner

●

میں روایت ہوں ایک بھولی ہوئی
اور تو جد توں میں رہتا ہے

●

کیسی نادانیاں ہوئیں ہم سے
جان دے دی جہان سے پہلے

●

گو کہ بستر تھے سنگ ریزوں کے
خواب پھولوں کے دیکھتے تھے ہم

●

سانس گھٹتی ہے بند کمرے میں
اور ہوا آ کے لوٹ جاتی ہے

●

کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ گئے
سب دعائیں قبول ہونے تک

●

اب تو عادت سی ہوئی ہے ہمیں
کانٹے چبھتے نہیں ہیں تلووں میں

●

تاریک سرنگوں میں کرن کوئی تو چمکے
آنکھوں نے کسی رنگ کو دیکھا ہی نہیں ہے

●

کتنی بے بس کھڑی ہے کونے میں
رو ح کو جسم پر نہیں قا بو

Scanned with CamScanner

کیا کروں دوسرے جنم کا میں
زندگی کل بھی اجنبی ہو گی

●

میں کہاں سے خریدوں شائستہ
میرے بچّے نے خواب مانگا ہے

شائستہ یوسف کے یہاں نسائی وجود کی بے حاصلی کا عذاب خوب صورتی سے شعر میں ڈھل گیا ہے۔ جہاں وہ فقط بھولی بسری روایت بھر ہے اور مرد ہمیشہ اپنے لیے نت نئے آفاق کی تلاش میں مصروف ہے، اسے اپنی نادانیوں کا شعور ہے پھر بھی دوسروں کی خاطر جان کی بازی ہارنا جیسے مقدر ٹھہرا ہے۔ بے بسی کا برفیلا جمود کانٹا چبھنے کی ٹیس بھی عادتوں میں شمار کر لیتا ہے۔ گویا عورت ایک مشین ہے جو فقط دوسروں کے احکام پر چلتی ہے۔ جس کی اپنی رضا، اپنی خواہش اور اپنی سوچ ہے ہی نہیں۔ پاؤں کے نیچے اپنی زمین چاہتی اور سر چھپانے کے لیے اپنے نام کی چھت تلاش کرتی یہ صنفِ نازک آج بھی سماج اور معاشرے میں اسی صدیوں پرانی صورتِ حال میں موجود ہے۔ اس لیے شاعرہ نے دوسرے جنم کی خواہش کا انکار کر کے دراصل اسی تاریخی اور تہذیبی جبر کو رد کیا ہے کہ جس کے سبب ہر دور میں عورت کی سماجی اور معاشرتی حالت یکساں رہی۔ آخری شعر میں ایک ماں کی بے بسی اور کم مائیگی کراہ بن گئی ہے کہ اپنے بچّے کی خواہش پوری کرنا جس کے اختیار اور بوتے سے باہر ہے۔ انہوں نے گھر کے تلازمے میں اسی محرومی کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

گھر ہے ایسا کہ جہاں کوئی دریچہ ہی نہیں
میں کروں کس سے شکایت کوئی اپنا ہی نہیں

●

چیختے ہیں تمام بام و در
گھر بھی جنگل کا ایک حصہ ہے

●

کوئی چھت ہے یہاں نہ دروازہ
کون سے گھر کو ہم سجائیں گے

Scanned with CamScanner

مختلف راستوں سے گزری ہوں
کسی رستے میں گھر نہیں آتا

●

یہ آسماں بھی سمندر دکھائی دیتا ہے
ہوا میں بہتا ہوا گھر دکھائی دیتا ہے

شائستہ صرف عورتوں کی بے بسی کی ہی تصویریں نہیں دکھاتیں بلکہ انہیں ایک زندہ انسان ہونے کے ناتے قدرت کی عطا کی ہوئی فطری توانائی کا بھی خوب احساس ہے۔وہ اسی قوت کے سہارے زندگی سے نبرد آزما ہونا جانتی ہیں:

باقی ہر ایک شئے پرائی ہے
صرف میرا وجود میرا ہے
آرزوئیں بلند اتنی ہیں
آسماں کو نگل رہا ہے دل

●

گو سہارا ہے صرف تنکے کا
پھر بھی دریا کو پار کرتی ہوں

●

لوٹ جاتی ہوں بادلوں کی طرف
پھر نئی بوند میں اترتی ہوں

●

میرا آنچل ابھی سلامت ہے
میری دیوانگی نئی ہے ابھی

●

برہنہ ڈالیاں مجھ کو سکھا رہی ہیں سبق
لباسِ حسن خزاں کا بہت انوکھا ہے

Scanned with CamScanner

شائستہ یوسف کی غزلوں میں صرف نسائی فکر و احساس کا درد ہی نہیں بلکہ ان کی دیدہ وری اپنی عصری حسیت کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے سبب دنیا کے بدلتے منظر نامہ پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ زندگی سے غائب ہوتی تہذیبی قدریں، ریاکاری منافقت، انسان جان کی ارزانی، خوف و دہشت، لاچاری اور تذبذب بھی ان کے اشعار میں موجود ہیں۔ چند نمونے دیکھئے:

کیسا بے بس کھڑا ہے چوراہا
دور ہوتے ہیں راستے مل کے

●

سارے انسان ہو گئے غائب
اب تو بس واقعات روشن ہیں

●

روشنی کی جہاں حکومت تھی
اب اندھیروں کا زور چلتا ہے

●

ہر طرف خوفناک جنگل ہیں
جانے کس سمت راستہ جائے

●

کون سے در کو کھٹکھٹاؤں میں
ہر گلی بولنے سے ڈرتی ہے

●

پھر فضاؤں پہ خوف طاری ہے
اڑنے والوں کی یہ سزا تو نہیں

●

کاٹ دیتی ہے سر درختوں کے
کبھی ایسی ہوا بھی چلتی ہے

Scanned with CamScanner

ان اشعار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ شائستہ یوسف کی غزلوں میں نسائی فکر اور عصری شعور کے ساتھ ساتھ اردو کی شعری روایت کا جمال بھی پنہاں ہے۔ ذاتی اور اجتماعی مسئلوں کا دکھ درد سلیقہ اور توازن کے ساتھ پیش کرنے میں ان کی ہنر مندی لائقِ تحسین ہے۔ نسائی ذات سے متعلق کہنہ رواجوں اور حصاروں کو رد کرنا دراصل روایت شکنی کا عمل ہے۔ لیکن شاعرہ اپنی شخصیت کی نرمی اور شائستگی سے ایسے مرحلے کامیابی کے ساتھ طئے کرتی نظر آتی ہیں۔ صنفی تفریق، ناانصافی اور نام نہاد غیرت کے حوالے سے فرسودہ بندشوں کے خلاف ان کی آواز تجربے کی سچائی اور مشاہدے کی گہرائی کی عکاس ہے۔ سادہ لفظوں اور زیادہ تر چھوٹی بحروں کا دلنشیں اور اثر آفریں استعمال ان کی شاعرانہ ہنر مندی کا اہم اور امتیازی وصف ہے۔ ان کے اکثر اشعار بظاہر چھوٹے چھوٹے نثری ٹکڑے نظر آنے کے باوجود غزل کے رمز سے بھرپور ہوتے ہیں۔ روایتی ڈگر کے مقابلہ ان کی بیش تر غزلیں مطلع سے عاری ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ان کی نظموں کی مانند ان کی غزلیں بھی ہم عصر شاعرات میں ان کی نمایاں اور معتبر مقام کا سبب ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

اُمِّ ہانی

رخسانہ نکہت لاری کا تعلق لکھنؤ کے ایک مہذب، ذی علم، مذہبی اور رئیس تاجر گھرانے سے ہے۔ان کی پیدائش ۷؍ستمبر ۱۹۵۳ء کو بہ مقام بھٹنی، ضلع دیوریا میں ہوئی۔ان کا قلمی نام ام ہانی ہے۔نثر ونظم دونوں اصناف میں ان کی تخلیقی شخصیت کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔'تجلیاتِ حرمین' کے نام سے سفرنامۂ حج ۱۹۸۶ء میں 'اسلام' عورت اور عصرِ حاضر' ۱۹۸۹ء میں اور 'سید مرتضی بلگرامی زبیدی۔حیات وعلمی کارنامے' ۱۹۹۰ء میں شائع ہو کر مقبولیت کی سند پا چکے ہیں۔آخر الذکر کتاب عربی ادب میں زبیدی کی علمی خدمات پر مشتمل ان کی پی۔ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے۔شاعری کے میدان میں حمد ونعت پر مشتمل پہلا مجموعہ 'نالۂ نیم شبی' ہے جو ۱۹۸۶ء میں اور دوسرا نظموں اور غزلوں کو اپنے اوراق میں سمیٹے 'سکوتِ شام' کے نام سے ۱۹۹۰ء میں منظرعام پر آیا۔ان کی شاعری لطافِ خیال، نفاستِ طبع اور تہذیبِ جذبات کی آئینہ دار ہے۔

ام ہانی کی غزلیں کلاسیکی رنگِ تغزل سے بھرپور ہیں، مگر روایتی عشقیہ فسانہ نہیں۔اس میں عشق ایک تجربہ ضرور ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو زندگی کے دوسرے تجربات ومشاہدات کو بھی انہوں نے بڑی ہنرمندی سے جذبۂ دل میں آمیز کیا ہے۔اس طور پر ان کی غزلیں فکر کی ہمہ گیری کے سبب تحریمِ عشق کے آداب اور قدیم شعری روایت کی رعنائیوں کا مرقع نظر آتی ہیں۔شاعری کے متعلق ان کا نظریہ ان کے اشعار سے واضح ہوتا ہے:

●

خامہ میں روشنائی کی صورت بھرا لہو
ہانی سخن وری کی جزا دے گیا مجھے

Scanned with CamScanner

محسوس کرو تو راقم کا چہرہ بھی ہے اور دل بھی
ورنہ تو بظاہر کچھ بھی نہیں ان کالے کالے حرفوں میں

●

ہاؔتی کا پہلا شعری مجموعہ مذہب سے گہری وابستگی اور عقیدت کا اشارہ ہے۔ 'سکوتِ شام' بھی صوفیانہ رنگوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ زندگی اور موت کے بارے میں ان کے تصورات فلسفیانہ فکر کا مظہر ہیں۔ زندگی کی بے ثباتی ،موت کی ابدیت ، جہانِ رنگ و بو کا سراب ہونا جیسے موضوعات ان کی غزلوں میں نماں مقام رکھتے ہیں۔ مضامینِ عشق بھی ہیں مگر زندگی کی بنیادی قدر کی صورت کلاسیکی شعری روئے کے ساتھ ہیں۔ چند اشعار دیکھیں :

زندگی آماجگاہِ رنج و غم
موت بس آرام ہی آرام ہے

●

رہ روِ راہِ ملکِ عدم سوچ لے
ہر مسافر کو زادِ سفر چاہیے

●

خود زندگی کا حسن دیا آرزو بھی دی
پھر اس کے بعد خوفِ قضا دے گیا مجھے

●

ہاؔتی سراب ہے یہ جہانِ ہزار رنگ
ہر رنگ عارضی ہے کوئی معتبر نہیں

ہاؔتی کی غزلوں میں شدتِ جذبات کی موجیں رواں ہیں۔ تصورِ عشق پاکیزہ اور نفاست سے معمور ہے جس میں ان کی نسائی خودداری ،عزتِ نفس اور مزاج کی متانت شامل ہے۔ اس لیے احتجاج کی بے باک لَے سنائی نہیں دیتی بلکہ ایک فنکار کا داخلی کرب حالات کی آنچ میں تپ کر

Scanned with CamScanner

غزل میں ڈھل گیا ہے۔ان اشعار میں جینے کا حوصلہ بھی ہے،آگے بڑھتے رہنے کا عزم بھی اور دکھ جھیلنے کی قوتِ برداشت بھی ہے۔سوزِ عشق توانائی کی صورت لفظوں میں موجود ہے ۔فطری رومانی جذبوں سے لبریز چند اشعار یوں ہیں:

خیال میں تری تصویر یوں ابھر آئی
زمیں پہ جیسے کوئی اپسرا اتر آئی
ہمارے شہرِ تمنا کو یوں بھی لٹنا تھا
تمہاری شوخ نگاہی مگر ابھر آئی

●

فاصلہ میرا ان کا کچھ بھی نہیں
پھر بھی اک عمر کی مسافت ہے

●

آئے نہ تجھ پہ حرف کوئی صرف اس لیے
پر اپنی آرزو کے کترتے چلے گئے

●

آتے ہیں چپکے چپکے بادِ صبا جھونکے
انجان سے فسانے دل کو سنا کے جائیں

●

نہ پاسکی میں کبھی جس کی گردِ پا تک بھی
وہی خیال میں بن کے غزال آتا ہے
قدم قدم پہ بہاروں کا حسن ہے لیکن
مجھے تو یاد تمہارا جمال آتا ہے

Scanned with CamScanner

ایک شاعرہ کی حیثیت سے ہاتی کو صنفِ نازک کی عظمت اور قامت کا احساس ہے۔ یہ طبقہ جو صدیوں سے استحصالی مرد اساس نظام کے جبر کا نشانہ ہے، بیٹی، بہن، ماں، بیوی اور محبوبہ غرض ہر صورت میں مرد کی زیر حاکمیت ہے۔ وہ اس جبریت اور محکومی کے زیر اثر آنسوؤں کو مقدر نہیں بناتیں بلکہ آنسوؤں کے چراغ جلا کر مستقبل کی راہوں کو منور کرنا چاہتی ہیں۔ دکھ درد کو زندگی کی ایک اہم قدر اور سرمایہ جان کر اس سے نظریں ملائے جینا جانتی ہیں۔ نسائی احساس فخر کے ساتھ سچائیوں کو بیان کرنے کا ہنر انہیں خوب معلوم ہے۔ نسائی فکر و احساس سے بھرے ان اشعار میں ان کے جذبوں کی ترجمانی دیکھئے:

بر باد و پائمال ہوں زخمی جگر ہوں میں
پھر بھی تری نظر میں کہاں معتبر ہوں میں
دیکھو تو اک مجسمۂ بے زبان و دل
سمجھو تو ایک معرکۂ خیر و شر ہوں میں

●

جاں دے کے بھی میں بارِ کرم سے دبی رہی
حالاں کہ میں نے قرض بہت کچھ ادا کیا

●

حرفِ محتاط کی تفسیر مجھے دیتا جا
جو سند ہو وہی تحریر مجھے دیتا جا
اس قدر تجھ سے ہوں مانوس نہ کر مجھ کو رہا
وہی حلقے وہی زنجیر مجھے دیتا جا

●

تمہیں تھے بحرِ کنارہ تمہیں ڈبونا تھا
میں موج موج مجھے پاش پاش ہونا تھا

Scanned with CamScanner

تم آفتاب میں شبنم، تمہیں ہی جھکنا پڑا
شعاع شعاع میں نمی کو تمہیں سمونا تھا

●

ثبت کر لو لبوں پہ مہرِ سکوت
بس یہاں بولنا قیامت ہے

●

محبت ہے مجھ سے محبت سے میں ہوں
ازل سے ابد تک مری داستاں ہے

●

نئے باب کھلنے دو ہم تو یہاں پر
گئے وقت کی داستاں ہو گئے ہیں

محبت عورت کی فطری جبلت ہے۔ ہاؔنی کی شاعری میں بھی اس کا آفاقی تصور موجود ہے جو روایتی نہیں بلکہ زندگی کی سچائیوں سے بھر پور ہے۔ محبت کا یہی شعور انہیں ذات کے ساتھ اپنے عصری ماحول سے جوڑ دیتا ہے۔ ان کی دردمندی انہیں زندگی کی کشمکش، جبریت، گھٹن، تنہائی ، اجنبیت اور منافقت سے روشناس کراتی ہے۔ رسم و رواج کے گھناؤنے پن ،تاجرانہ ذہنیت ،انسان دشمنی اور خودغرضی جیسی پھلتی پھولتی تلخ سچائیوں کو وہ ایک باشعور فن کار کی طرح جمالیاتی رنگ اور شاعرانہ آہنگ میں سمیٹ دیتی ہیں۔ جو ان کے وسعتِ خیال، فکری بصیرت اور فنی آگہی کا مظہر ہیں:

یوں تو تنہائیاں مقدر ہیں
بھیڑ اتنی کہ شانے چھلتے ہیں

●

Scanned with CamScanner

آج کی زندگانی کی تقدیر میں
چلتے رہنا تو ہے پر بسیرا نہیں

●

عافیت کے موسموں کا دور چل رہا تھا جب
کون تھا غضب کا جو عذاب لے کے آ گیا

●

کوئی دریا کی تہوں میں نہیں جانے والا
صرف لہروں ہی میں تر ہونے پہ اصرار ہے آج

●

دیوانہ چین ڈھونڈنے جائے تو پھر کہاں
اے دشت تو بھی شہر سا بے خواب ہو نہ جا

●

یہ کیسی اجنبیت دی ہمیں مصروف وقتوں نے
کہ بچپن کی شناسائی پہ بھی پہرے بٹھائے تھے

●

تا حدِ نظر گویا ہے جاگیر انہیں کی
کہنے کو یہاں رہتے ہیں دو چار برس سے

●

نہ جانے کس طرح ہر چال الٹی ہو گئی ہائے
بڑی ترتیب سے ہم نے سبھی مہرے سجائے تھے

●

درج بالا اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ام ہانی نے خارجی حقیقتوں کو بھی داخلیت سے ہم

Scanned with CamScanner

آہنگ کر کے غزل کا قابلِ قدر حصہ بنا دیا ہے۔ تجربوں کو جذبوں میں اس طرح گھلا دینا کہ کیف و فکر کے درمیان فاصلہ نہ رہے، اس ہنر کو شاعرہ بخوبی جانتی ہیں۔ ان کا طرزِ بیان سادہ اور رواں ہے۔ کہیں کہیں خوب صورت پیکر تراشی کے نمونے بھی موجود ہیں:

آنکھیں کھلی ہیں خوابِ بہاراں کے بعد جو
انگڑائی لے رہی تھی خزاں دور دور تک

●

فصلِ گل کا الوداعی ہے سلام
ایک شاخِ سرنگوں بھی ساتھ ہے

●

شک کے ناگ میں لپٹا ہے
پیار بھرا سرمایہ پھر

●

لہریں واپس آ جاتی ہیں
ساحل آہیں بھرتا ہے

●

جھلسے ہوئے ہیں منظر صحرائے آرزو کے
شاخوں سے دھند بن کر آہیں لپٹ گئیں ہیں

●

امِ ہانی غزلیں اپنے جذبہ و خیال کی شدت کے سبب لطف انگیز تو ہیں مگر شاعرانہ ہنر مندی کے باوجود اپنا منفرد رنگ نہیں دکھا پاتیں۔ نئے فکری زاویے کے باوجود روایتی اسلوب کی پیروی کرتی ہوئی ان کی غزلیں ان کی حساس اور دردمندانہ تخلیقی شخصیت کا مظہر ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

پروینؔ شاکر

جدید غزل میں جونئی، نرم و نازک اور انوکھی آواز اپنی نغمگی اور کشش کے سبب دل کو چھو جاتی ہے تو وہ پروینؔ شاکر کی ہے۔ پانچ مجموعے ان کی نسائی جمالیات اور شاعرانہ شخصیت کی شناخت ہیں۔ پروینؔ کی ولادت ۲۴/نومبر ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ انہوں نے کراچی یونی ورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ کچھ عرصہ سرسید گرلز کالج، کراچی میں معلّمہ کے فرائض بھی انجام دیئے۔ پھر ملک کی انتظامیہ میں شامل ہو کر کسٹم کمشنر کے عہدے پر فائز رہیں۔ ۲۶/دسمبر ۱۹۹۴ء میں آفس جانے کے دوران ایک سڑک حادثے میں ان کی وفات ہوگئی۔ اور یوں محض ۴۲ سال کی عمر میں اردو غزل کی ایک منفرد آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ اپنے پیچھے وہ شاعری کا ایک گراں قدر سرمایہ چھوڑ گئیں جن میں 'خوشبو' ۱۹۷۷ء میں 'صد برگ' ۱۹۸۲ء میں 'خود کلامی' ۱۹۸۵ء میں اور 'انکار' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد 'کفِ آئینہ' ۱۹۹۷ء میں ان کی بہن نسرین شاکر نے شائع کرایا۔ 'خوشبو' لطافتِ حسن اور صداقتِ عشق کی انتہا ہے۔ 'صد برگ' سفرِ حیات میں تلاش حسن اور تکمیل حسن کی داستاں ہے۔ 'خود کلامی' رومانیت سے اظہاریت کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے۔ 'انکار' عالم گیر سطح پر زندگی کے شکست و ریخت کا تجربہ ہے اور 'کفِ آئینہ' بند ہوتے بابِ زندگی کا المیہ ہے۔

غزل صدیوں سے جذبات و تجرباتِ عشق کی پیش کش کے لیے اپنی دلکشی اور اثر آفرینی کے ساتھ شعری روایت کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ مگر اس کی طویل تہذیبی اور تاریخی روایت میں پروینؔ شاکر نے پہلی بار کم سنی کے نسائی جذبوں کو زبان بخشی ہے۔ ان کی پوری شاعری بنیادی اعتبار سے عورتوں کی نفسیات کی ترجمان ہے۔ وہ سارے تصورات و توہمات جو لڑکیوں سے وابستہ ہیں

Scanned with CamScanner

انہوں نے بڑی دل فریبی سے غزلوں میں ڈھال دئے ہیں۔ محبوب کی تمنا، ہجر کا دکھ، خاموشی کی بلاغت، گفتگو کا گونگا پن اور وصل کی رنگینی غرض سارے رنگ ان کی غزلوں میں سمٹ آئے ہیں۔ جدتِ اظہار کا انوکھا پن انہیں منفرد اور دل نشیں بنا دیتا ہے:

بہار نے مری آنکھوں پہ پھول باندھ دئے
رہائی پاؤں تو کیسے حصارِ رنگ میں ہوں

●

ہتھیلیوں کی دعا پھول لے کے آئی ہو
کبھی تو رنگ مرے ہاتھ کا حنائی ہو

●

میں اپنے حصے کے سکھ جس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح سے پیارا ہو

●

بچپنے کا ساتھ ہے اور ایک سے دونوں کے دکھ
رات کا اور میرا آنچل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

●

آنکھ کو یاد ہے وہ پل اب بھی
نیند جب پہلے پہل ٹوٹی تھی

حصارِ رنگ میں گھرے کم عمری کے سارے سچے اور معصوم جذبے اپنی وارفتگی، حسن وجمال کی سادگی اور رومانی ارتعاش سے بھرپور ہیں۔ ان میں جذباتی واقعیت کی فراوانی ہے، خیال کی لطافت ہے اور خوش گوار آہنگ کی آمیزش ہے۔ جو اردو غزل میں نئے، انوکھے اور چونکا دینے والے تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں:

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

Scanned with CamScanner

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

•

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

•

انگلیوں کو تراش دوں لیکن
عادتاً اس کا نام لکھیں گی

•

زندگی محبت سے عبارت ہے۔ جذبۂ شوق دل کی گہرائیوں میں کونپل کی طرح سر اٹھاتا ہے اور اظہار کے راستے تلاش کرتا لفظوں میں سما جاتا ہے۔ جذباتیت شدید آرزومندی کو جنم دیتی ہے۔ پروین شاکر ان کیفیات کو لفظی پیکروں میں پیش کر کے قاری کو مسحور کر دیتی ہیں۔ دل نشین لفظوں کا بہاؤ ہے جو شعر میں مترنم آہنگ کے ساتھ رواں دواں ہے۔ یہی غنائیت سے لب ریز نادر تجربے جادوئی اثر دکھاتے ہیں:

دھنک دھنک مرے پوروں کو خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا

•

یہ کیا کہ میں تری خوشبو کا صرف ذکر سنوں
تو عکس موجۂ گل ہے تو جسم و جاں میں اتر

•

پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی ان ہونٹوں کا سایہ دیکھوں

Scanned with CamScanner

اداس شب میں کڑی دوپہر کے لمحوں میں
کوئی چراغ کوئی صورتِ گلاب اترے

●

گلابی پاؤں مرے چمپئی بنانے کو
کسی نے صحن میں مہندی کی باڑھ اگائی ہو

عشق کے فطری جذبے سے گریز ممکن نہیں۔ پروین شاکر کے یہاں بھی عشق حسن کے دیدار کا تمنائی آرزوئے قرب میں بے قرار ہے۔ ان کی غزلیں میں محبوب کا کوئی ماورائی پیکر نہیں بلکہ زندہ انسانی وجود ہے۔ اور شاعرہ کی چاہت کی مانند ہی منفرد ہے۔ جس کی بے اعتنائی، انا پرستی اور مردانہ بانکپن سے شاعرہ کو عشق ہے۔ اس لیے ان کی پوری شاعری عشق اور حسن سے مملو ہے۔ ان کا محبوب اردو شاعری کی روایت سے کتنا مختلف ہے اس کی مثال شاعرہ کے پیش کردہ تجربوں میں اپنی بھرپور نغمگی کے ساتھ موجود ہے:

اتنی جسارتیں تو اسی کو نصیب تھیں
جھونکے ہوا کے کیسے گلے سے لپٹ گئے

●

میں ایسے شخص کی معصومیت پہ کیا لکھوں
جو مجھ کو اپنی خطاؤں پہ بھی بھلا ہی لگا

●

انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اٹھ کے بند مری ہر کتاب کر دے گا

●

صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا ہے
ذکر ہو نہ اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

Scanned with CamScanner

اس خوف سے وہ ساتھ نبھانے کے حق میں ہے
کھو کر مجھے یہ لڑکی کہیں دکھ سے مر نہ جائے

یہ محض محبوب کا تصور نہیں بلکہ ایک زندہ انسانی وجود ہے جو پروین شاکر کے اشعار میں منعکس ہے۔ جس کی معصومیت، انا پرستی، تکبر اور مصلحت پسندی کی صفت کو شاعرہ اپنے اشعار میں پرو رہی ہیں۔ جذبۂ عشق کی شدت رفتہ رفتہ ان کے اندر وہ حوصلہ بخشتی ہے کہ وہ بڑے اعتماد اور وقار کے ساتھ اپنی محبت کو زمانے سے روشناس کراتی ہیں۔ نشاطِ وصل کے لمحوں میں بھی ان کے یہاں ایک مخصوص سرفرازی کا احساس نمایاں رہتا ہے کہ یہ کیفیت بھی اظہار کی تہذیب اور لہجے کی شائستگی کی متقاضی ہے۔ ان لمحوں کے پرکیف تجربوں کو شعر میں اس طرح جذب دیکھئے :

اس کے وصل کی ساعت ہم پہ آئی تو جانا
کس گھڑی کو کہتے ہیں خواب میں بسر ہونا

●

گاہِ قریبِ شاہ رگ گاہِ بعیدِ وہم و خواب
اس کی رفاقتوں میں رات، ہجر بھی تھا وصال بھی

●

بدن کا پہلے پہلے آگ چکھنا
رگ و پئے میں کوئی لذت عجب تھی

●

بات خوشبو کی طرح پھیل گئی
پیرہن میرا شکن اس کی تھی

●

وہ آگ ہے کہ مری پور پور جلتی ہے
مرے بدن کو ملا ہے چنار کا موسم

Scanned with CamScanner

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

●

حسن و عشق اور ہجر و وصال کے ان تجربوں میں ایک عورت کا احساس جمال پہلی بار اردو غزل کا حصہ بنا ہے۔ ورنہ یہ صنف اب تک شعرا کی تجربہ گاہ ہی بنی ہوئی تھی جس میں بت کی طرح تراشا گیا عورت کا فقط سراپا تھا جو احساس کے کیف سے خالی تھا۔ پروین کو لذتِ غم محبوب بھی بہت عزیز ہے۔ اس غم کا سبب ہجر ہے اور بغیر ہجر کے عشق کی تکمیل ممکن نہیں۔ غموں کی آنچ شخصیت کو نکھارتی ہے۔ ہجر یادوں کو جگاتا ہے۔ یادیں ماضی اور حال کے درمیان لطیف رشتہ بن جاتی ہیں جن کی خواب ناک کیفیت انہیں سرشار کرتی ہے۔ ان یادوں کو شاعرہ نے کس طرح منظروں میں قید کیا ہے اس ہنر کو ان اشعار میں دیکھئے :

پھر اس کے بعد نہ دیکھے وصال کے موسم
جدائیوں کی گھڑی چشم گیر ایسی تھی

●

ریل کی سیٹی میں کیسی ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا

●

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کی ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہوئی

●

پروین نسائی نفسیات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ جس کے سبب ان کے یہاں عورتوں کی روزمرہ کے معاملات و کیفیات بھی کچھ اس طرح ملتے ہیں۔ مثلاً:

کہیں رہے وہ مگر خیریت کے ساتھ رہے
اٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی

Scanned with CamScanner

آ ج تو اس پہ ٹھہرتی ہی نہ تھی آ نکھ ذرا
اس کے جاتے ہی نظر میں نے اتاری اس کی

●

پلکوں کو اس کی اپنے دوپٹے سے پونچھ دوں
کل کے سفر میں آج کی گردِ سفر نے جائے

●

پروین شاکر کی شاعری 'خوشبو' سے آگے بھی سفر کرتی ہے۔ جہاں صرف دل موہ لینے والی رومانیت ہی نہیں بلکہ زندگی کی تلخ سچائیاں شاعرہ کے سامنے صف باندھے کھڑی ہیں۔ یہ تلخیاں انہیں کڑی دھوپ کی شدت سے آشنا کراتی ہیں سماج اور معاشرے کی سفاکیاں انہیں اپنے تیور دکھاتی ہیں۔ اور تب وہ ذات کے حصار سے نکل کر اجتماعی زندگی میں شامل ہوتی ہیں خود کی ذات کا المیہ انہیں دوسروں کے دکھ درد کا احساس دلاتا ہے۔ آ گہی کے دریچے کھلتے ہی شاعرہ کا نرم و نازک لہجہ کٹیلا ہو جاتا ہے۔ جبر و تشدد کے خلاف وہ ایک عورت کی نظر سے معاشرے کو جانچتی پرکھتی ہیں ۔اسی باعث ان کے یہاں احتجاج کا وہ رویہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے نہ شعریت پر حرف آتا ہے نہ خیال پہ آنچ بلکہ شاعرہ کے پختہ شعور کی شناخت ہوتی ہے۔ خیال کی شائستگی کے ساتھ لہجے کی نشتریت اپنا الگ ہی رنگ دکھاتی ہے:

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی عجب تھی
سچ جہاں پابستہ ملزم کے کٹہرے میں ملے
اس عدالت میں سنے گا عدل کی تفسیر کون

●

ہے مسئلہ مرے سورج مکھی قبیلے کا
کہ صبح نکلے مگر ساتھ آفتاب نہ ہو

Scanned with CamScanner

میں ڈھال لیے سمتِ عدو دیکھ رہی تھی
پلٹی تو مرے پشت میں تلوار گڑی تھی

●

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

●

ہم وہ شب زاد کہ سورج کی عنایات میں بھی
اپنے بچوں کو فقط کور نگا ہی دیں گے

●

گھمسان کا رن جیت کے لب بستہ کھڑی ہوں
میں پشت پہ آئے ہوئے ہر وار کے آگے

●

پروینؔ شاکر کی شاعری ماورائی نہیں بلکہ خالص زمینی اور انسانی فکر کی شاعری ہے۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ ہمارے دانشوروں نے ان کو صرف 'خوشبو' کے پلو میں ہی باندھ رکھا ہے۔ ورنہ وقت کے ساتھ ساتھ پروینؔ کے جذبوں کے وفور میں بھی کمی آئی ہے اور وہ باشعور عورت کی طرح سماج و معاشرہ کا اصلی چہرہ بھی دکھاتی نظر آتی ہیں۔ لیکن لوگوں کو بس کم سن دوشیزہ والی شاعری ہی یاد رہتی ہے۔ شاید ابھی بھی نسائی ذہن کے فکری زاویے ان کی سوچ سے پرے ہیں۔ شاید یہ احساس لذتیت اردو شاعری کی طویل کلاسیکی روایت کی دین ہے۔ جہاں صرف عورتوں کا سراپا لب و رخسار کی لالی اور شیرینی تک ہی محدود رہا ہے کہ اس کے آگے ان کے تخئیلات کے پر جلتے ہیں۔ پروینؔ کی شاعری صرف حسن و عشق کی حکایت ہی نہیں بلکہ ایک عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی ناہمواری، نفسیاتی گھٹن، مذہبی عقیدے کا کھوکھلا پن، طبقۂ اناث کی محکومیت، مرد کی جبریت اور اقدارِ حیات کی شکست و ریخت غرض وہ

Scanned with CamScanner

مسائل جو صدیوں سے زندہ عورت کا المیہ ہیں:

اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر
ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا

●

جو بادلوں سے بھی مجھ کو بچا کے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

●

اک چادرِ دلداری ہے اس طرح سے مجھ پر
تن ہے کہ الجھتا رہے سر ہے کہ کھلا جائے

●

فیصلے سارے اسی کے ہیں ہماری بابت
اختیار اپنا بس اتنا کہ خبر میں رہنا

●

کس سے پوچھوں پسِ دیوارِ چمن کیا گزری
میرے گھر میں تو ہوا مہر بہ لب آئی ہے

●

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا

●

ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

●

Scanned with CamScanner

زمیں کی پشت تحمل سے دوہری ہو جائے
اگر وہ بوجھ اٹھائے جو ہم اٹھاتے ہیں

●

اس طرح کھینچی ہے میرے گرد دیوارِ خبر
سارے روزنوں کو بے نظر اس نے کیا

●

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
جرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

●

لازم تھا اب کہ ذوقِ تماشا کو دیکھتی
کب تک تمہاری آنکھ سے دنیا کو دیکھتی

●

ہر بار ایڑیوں پہ گرا ہے مرا لہو
مقتل میں اب بہ طرزِ دگر جانا چاہیے

●

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد قتل گاہ میں ہے

ایک حساس شاعرہ کی طرح ان کا دل بھی سیاسی صورتِ حال کی منافقت پر کڑھتا ہے۔
جس میں سب سے زیادہ زیاں معصوم انسانوں کا ہی ہوتا ہے۔شہری ماحول کا مصنوعی پن ہو،محنت کشوں کا استحصال ہو یا جبر و تشدد، بدلتے وقت کے مزاج پر پروین شاکر کی گہری نظر ہے۔ان کے ملک میں آمریت اور جمہوریت کی رسہ کشی کے سبب حکومتوں کو بھی لمبے عرصے تک فوج کے زیرِ سایہ رہنا پڑا۔ایسے میں دستورِ زباں بندی بھی لازمی تھا۔اور پروین شاکر ملک کی انتظامیہ میں اعلیٰ عہدے

Scanned with CamScanner

پر فائز تھیں تو انہیں اس آمریت اور جبر کے خلاف احتجاج کرنا بھی ان کے لیے مشکل رہا ہوگا۔ پھر بھی ان کی حساسیت مصلحتوں کو نظر انداز کر کے ایسے اشعار کہلوا دیتی ہے جو ان کی حق گوئی کا مظہر ہیں:

حاکمِ شہر کے اطراف وہ پہرہ ہے کہ اب
شہر کے دکھ اسے موصول نہیں ہو سکتے

●

نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے

●

سب خیریت کا سن کے بدن سرد پڑ گئے
کس کو نہیں خبر کہ ہے بین السطور کیا

●

ہم اہلِ حاجت و اربابِ احتیاج تو کیا
فقیہِ شہر بھی اب حبِ زر پہ زندہ ہیں

●

کیا عجب جو سر کٹے لوگوں کی پرچھائیں ملی
شہر میں کھلنے لگے ہیں جا بجا جادو کے گھر
پہلے یہ منظر پڑھا تھا صرف اب دیکھا بھی ہے
بانسری بجتی رہی جلتے رہے نیرو کے گھر

●

گھروں پر جبریہ ہوگی سفیدی
کوئی عزت مآب آنے کو ہے پھر

Scanned with CamScanner

ہنستی ہوئی آنکھوں کا نگر کہتے رہے ہم
جس شہر میں نوحے پسِ دیوار بہت تھے

●

سوچ کا رشتہ سانس سے ٹوٹا جاتا ہے
لو سے زیادہ جبر فضا کے حبس میں ہے

●

بارشیں جاڑے کی اور تنہا بہت میرا کسان
جسم اور اکلوتا کمبل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

●

دستِ ہوا نے جیسے درانتی سنبھال لی
اب کے سروں کی فصل سے کھلیان پٹ گئے

●

بچوں کے خواب پی کے بھی حلقوم خشک تھے
دریا کی تشنگی میں بڑی وحشتیں رہیں
تعویز والے ہاتھ مگر مچھ کے پاس تھے
تہہ سے دعا لکھی ہوئی پیشانیاں ملیں

●

اپنے عہد کی جبریت اور سفا کی کو شہر میں جادو گھر، نیرو کی بجتی بانسری اور سلگتے گھر، حب زر میں ڈوبا قہقہہِ شہر، دستِ ہوا کی درانتی، کھلیانوں میں سروں کی فصل، دریا اور اس کی وحشت بھری پیاس، محفوظیت کی تعویز سجائے ہاتھ مگر مچھ کا لقمہ بنتے اور جبینوں پر آیت لکھے سر سمندر میں تہہ نشیں ہوتے، یہ ساری تصویریں کتنی سچی ہیں۔ وقت نے شاعرہ کو مہلت ہی نہیں دی کہ یہ رنگ ان کی

Scanned with CamScanner

شاعری میں نکھر سکتا۔ اپنی ایک نظم 'مسئلہ' میں وہ خود سے سوال کرتی ہیں:

میرے
اندر کی یہ سادہ لوح ایلس
حیرت کی جمیل وادیوں سے
وحشت کے مہیب جنگلوں میں
آئے گی —— تو اس کا پھول لہجہ
کیا جب بھی صبا نفس رہے گا ——؟
وہ خود کو ڈِس اون کر سکے گی ——؟

●

اور ایلس وحشت کے جنگلوں میں گم ہو گئی جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ رہ گیا بس اس کا پھول سا خوشبوؤں بھرا لہجہ جو تتلیوں کی طرح کانٹوں میں گھرے پھولوں کو چھوتا اور چومتا ہے لیکن اس کی محتاط روی اس کے پروں کو چھلنے نہیں دیتی۔

●●

Scanned with CamScanner

عشرت آفرین

عشرت آفرین کی ولادت ۲۵ ر دسمبر ۱۹۵۶ء میں کراچی میں ہوئی۔ اردو شاعری کی دنیا میں ایک نئی، توانا اور گمبھیر آواز بلند کرتا ان کا پہلا شعری مجموعہ 'کنج پیلے پھولوں کا' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ جس نے عورتوں کی نفسیاتی، سماجی، معاشرتی، اقتصادی، روایتی، تہذیبی اور عصری زندگی کے مختلف نادیدہ پہلوؤں کا انکشاف کیا۔ پیلا رنگ علامتی حیثیت کا حامل ہے جو اپنے اندر بے پناہ امکانات رکھتا ہے۔ یہ رنگ [illegible] پھولتی سرسوں کا ہے جو موسم بہار کی آمد کی پیغامبر ہے۔ یہ رنگ مسرت اور شادمانی کی علامت بھی ہے بالخصوص شادی بیاہ کے موقع پر استعمال ہونے والے ابٹن، ہلدی وغیرہ کا رنگ۔ یہ رنگ ہجر، غم اور خوف کا مظہر بھی ہے اور خزاں کی رت کا اشاریہ بھی۔ یہ رنگ جبر، تشدد اور استحصال سے بھی عبارت ہے۔ اس رنگ کا تنوع اور تہہ داری آفرین کے شعری مزاج اور تخلیقی روئے کی نشان دہی میں معاون ہے۔

عشرت آفرین کے مجموعہ کا انتساب ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ کہنے کو ننھے منے فقط تین مصرعے مگر صدیوں کا دفتر سمیٹے ہوئے، فکر کے نئے دریچے کھولتے، ان چھوئے اور ان دیکھے گوشوں سے روبرو کراتے ہیں:

مراقد

میرے باپ سے اونچا نکلا

اور مری ماں جیت گئی............!!

ان کی غزلوں میں نسائی جذبہ وفکر کی رنگارنگی، تجربوں اور مشاہدوں کی سچائی کا پر اثر جمالیاتی کیف ملتا ہے۔ عورتوں کے احساسات اور نفسیات کو پیلے رنگ کی علامت میں جذب کر کے آفرین

Scanned with CamScanner

نے دلکش رمزیہ انداز میں شعر کا پیرہن عطا کیا ہے۔ زرد رنگ کے کچھ جلوے دیکھئے:

وہ حرف تھا نہ ستارا مگر چمکتا تھا
کہ میرے زرد گلابوں کے بیچ مہکا تھا

●

کسم کے پھول مرے گھر میں وہ لگا ہی گیا
یہ رنگ میرے دوپٹے کو راس آ ہی گیا

●

سرخ رتوں کی آگ گھروں کو آنے تک
آنگن پیلے پتوں سے بھر جاتے تھے

●

یوں تو برکھا کی تھالی میں کیا کچھ ہے
تو بھی اپنے حصے کے اٹھا لے پیلے پھول

●

کھیتوں میں جو دھوپ چن رہے تھے
وہ ہاتھ بنے تھے خوشبوؤں سے

●

پسلیوں کے نحیف نیزوں پر
بھوک کے زرد آفتاب اترے

●

وحشی زلفیں پاگل آنکھیں
مکھڑے زرد گلابوں والے

●

Scanned with CamScanner

ہرے بھرے چھپر کے اوپر
پیلی کلیاں کندن بیلیں

●

یہ زرد پھولوں کے کنج دیکھو
یہاں بھی آؤ کہ میں ادھر ہوں

ان اشعار میں رنگوں کے حوالے عشرت آفریں کی دلکش جمالیاتی فکر کے مظہر ہیں۔ رنگ اور جذبوں کی ہم آہنگی سے نسائی نفسیات کے خوب صورت نقوش اجاگر کیے گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبۂ خودداری عورت کا سب سے توانا جذبہ بن کے ابھرتا ہے۔ انہیں نہ صرف اپنے عورت ہونے پر فخر ہے بلکہ دوسروں سے بھی اپنی صنف کے زندہ وجود ہونے کا اثبات چاہتی ہیں۔ صدیوں صعوبتیں جھیلتے، کم تر سمجھے جانے اور محبوس رہنے کے باوجود نسائی شخصیت سے اس کی فطری نرمی، قوتِ برداشت اور دردمندی کے جذبات کم نہیں ہوتے۔ وہ ہر زمانے میں زندگی کی تخلیق سرچشمہ بھی رہی، ممتا کی مورت بھی اور نئی نسل کی نگہباں بھی۔ عشرت آفریں کی شاعری میں محنت کش طبقے کی عورت کے احساسات ہیں جو جبر و محکومی کے ماحول میں بھی اپنی توانائی کو زندہ اور قابل فخر بنائے رکھتی ہیں:

خاک میں کھیل کے سب نشو و نما پائی ہے
بنتِ افلاس ہوں میں بھوک تو میری ماں تھی

●

مجھ میں چھٹی حس جاگی تازہ مٹی کی
طغیانی ہے پھر پانچوں دریاؤں میں

●

جی اٹھے گی پھر پرانی راکھ اڑ جانے کے بعد
ہے مجھے معلوم کتنی میرے اندر آگ ہے

●

Scanned with CamScanner

لاکھ پتھر ہوں مگر لڑکی ہوں
پھول ہی پھول ہیں اندر میرے

●

عشرت آفریں کی یہی خوداعتمادی زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے۔ایسا نہیں کہ ان کے یہاں فقط زنجیری ساعتوں کی سختیاں ہیں بلکہ زندگی کا سب سے بڑا سچ رومان اور خواب نا کی بھی ہے۔انسان خواب نہ دیکھے تو بجائے زندوں کے مردوں میں شمار ہو جائے۔اور جو شاعرہ پھولوں کی زبان میں بات کرنا جانتی ہو اس کی آنکھیں تو ضرور ہی خواب آشنا ہوں گی۔زمانے کے سامنے لاکھ وہ چٹان کی صورت اختیار کر لے لیکن اندر کی دنیا میں تو پھول ہی پھول کھلے رہتے ہیں۔خوشبو اور رنگوں میں اپنے نازک رومانی احساسات کو آمیز کر کے آفریں بھی شاعری میں پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔سرسبز و شاداب خیالات اور لہجے کی نادرہ کاری شعر میں کس طرح پھول کھلاتی ہے دیکھیے :

میں پھول پھول سفر کر رہی تھی خوابوں کا
پھوار لائی تھی تحفہ نئے گلابوں کا

●

تیرا نام لکھتی ہیں انگلیاں ہواؤں میں
یہ بھی اک دعا ہوگی وصل کی دعاؤں میں

●

سب لڑکیاں کم سخن رہیں گی
بس خوابوں کے پھول گوندھنے تک

●

وہ چاند کا فسوں لیے بڑھا تھا
میں موتیا تھی اور بکھر بکھر گئی

●

Scanned with CamScanner

پھول بہلانے کبھی چاند منانے آئے
یوں مرے ساتھ ترے ہجر کی راتیں جاگیں

●

اٹا ہوا تری خوشبو سے پیرہن دیکھوں
بھرے ہوئے ترے رنگوں میں دست و پا دیکھوں

●

وہ بکھری بکھری سی کیاریوں میں سفید کلیاں
وہ شامِ فرقت کی پیلی پیلی اداس خوشبو

●

ان اشعار میں رنگ اور خوشبوؤں کا لمس شاعرہ کے شدید جمالیاتی تصور کا عکاس ہے۔ آفریں کی شدید رومانیت کے باوجود ان کا لہجہ تھما تھما سا ہے۔ نسائی فطرت کی نزاکت اور تحمل ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ رمز و اشارے کی آمیزش اندازِ بیان کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ غزل کی شعری روایت کا احترام اور جدت طرازی کا لطیف جمالیاتی رویہ ان کی غزلوں کی پہچان ہے۔ غزل کے وسیع افق پر ان کے جذبات دھنک کی مانند پھیلے ہوئے ہیں:

ہجر و وصال جس میں ہم ہیں
اے لذتِ درد انتہا ہے

●

وہ زخم جو بے نمو رہا ہے
اس زخم کی روشنی سوا تھی

●

دیکھ کر تمہیں خوش ہو جاؤں
میری آسودگیِ جاں دیکھو

●

Scanned with CamScanner

چاند کی دھیمی دھیمی چاپ ابھرتے ہی
سارے سپنے پھول پہن کر آتے ہیں

●

چلو میں ہو درد کا دریا خیال میں اس کے ہونٹ
یوں بھی خود کو پیاسا رکھنا کتنا مشکل ہے

●

چٹکی بھر صندل سا خواب
تھالی بھر آشا رکھنا

●

شاعرہ کی دردمند شخصیت اور اور احساس کی شدت انہیں دوسروں کے دکھوں میں بھی شریک رکھتی ہے۔ان کا سماجی اور تہذیبی شعور موجودہ نظام حیات کی سفا کی اور جبریت کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔زمین دارانہ سماج میں مردوں کی حاکمیت جھیلتی عورتوں کی گھٹن بھری زندگی، جہالت ،توہم پرستی اور بوسیدہ رواجوں کی جکڑن میں دبی کچلی آبادی ان کی فکر کا محور ہے۔گاؤں کے محنت کش طبقوں کا دکھ اور ان کی افلاس زدہ زندگی سے حاصل تجربوں اور مشاہدوں کو آفریں کے جذبوں کا وفور رمز عطا کرتا ہے اور ایسے اشعار جنم لیتے ہیں:

یہ غم نہیں کہ میں پابندِ غمِ دوراں تھی
رنج یہ ہے کہ مری ذات مرا زنداں تھی

●

اس شہرِ کج کلاہ کے آثار دیکھنا
اور خود کو بے ردا سرِ بازار دیکھنا

●

جس میں غریبِ شہر کی بیٹی چنی گئی
اے میرے شہر یار وہ دیوار دیکھنا

Scanned with CamScanner

بہت ہے یہ روایتوں کا زہر ساری عمر کو
جو تلخیاں ہمارے آنچلوں میں باندھ دی گئیں
ان انگلیوں کو چومنا بھی بدعتیں شمار ہو
وہ جن سے خاک پر نمو کی آیتیں لکھی گئیں

●

روایتوں کی قتل گاہِ عشق میں
یہ لڑکیاں صلیب ہو کے رہ گئیں

●

ٹوٹی چوڑی ، ٹھنڈی لڑکی ، باغی عمر
سبز بدن، پتھرائیں آنکھیں، نیلے ہونٹ
سونا آنگن ، تنہا عورت، لمبی عمر
خالی آنکھیں ، بھیگا آنچل ، گیلے ہونٹ
اتنا بولوگی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی یہ ہے لڑکی سی لے ہونٹ

●

جنہیں کہ عمر بھر سہاگ کی دعائیں دی گئیں
سنا ہے اپنی چوڑیاں ہی پیس کر وہ پی گئیں

●

وہ جنگلوں سے نکالے گئے غریب پرند
جہاں گئے انہیں مسکن ملا عقابوں کا

●

یہ مرد اساس معاشرے میں جیتی عورت کی زندگی کی سچی اور نادر تصویریں ہیں جو اردو شاعری کے کینوس پر پہلی بار نظر آئی ہیں۔ تلخیوں کے بیان میں آفرین کا لہجہ انفعالی نہیں ہوتا بلکہ وہ

Scanned with CamScanner

تضادوں کے درمیان بھی توازن کی راہ کھوج لیتی ہیں۔فن کار کا یہی رویہ خوش آئند زندگی کی بشارت دیتا ہے۔وہ خوداعتمادی اور خودداری کے ساتھ روایتی سماج کے منظر نامہ کو بدلنا چاہتی ہیں۔جہاں ہر پل عورتوں اور معصوم بچیوں پر قہر کی بجلیاں گرتی ہیں۔ان کی مختلف کیفیتوں کو پیش کرتے ہوئے وہ مہذب معاشرے سے سوال بھی کرتی ہیں اور ان کی سفید پوشی کا نقاب اتار دیتی ہیں تو عزت و حرمت کی دہائی دینے والا سسٹم بے لباس ہو جاتا ہے۔شاعرہ کی روح کا کرب ان اشعار میں چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

لڑکیاں ماؤں جیسے مقدر کیوں رکھتی ہیں
تن صحرا اور آنکھ سمندر کیوں رکھتی ہیں
عورتیں اپنے دکھ کی وراثت کس کو دیں گی
صندوقوں میں بند یہ زیور کیوں رکھتی ہیں

●

جو معبد میں دیے جلانے آئی تھی
وہ لڑکی کیوں اندھیاروں کی ندر ہوئی

●

یہ محنتیں ہیں مگر اجرِ آب وگل کے بغیر
ہوا میں پھول بنائیں گی انگلیاں کب تک

●

کپاس چنتے ہوئے ہاتھ کتنے پیارے لگے
مجھے زمیں سے محبت کے استعارے لگے

●

تم جسے انا سمجھ رہے ہو
وہ مری بقا کا مسئلہ ہے

Scanned with CamScanner

●

مرا وجود تو مٹی کا اک گھروندا ہے
مرا ضمیر گھروندے میں اک دیا سا ہے

●

مجھے شریکِ بہاراں کیا ہے ٹھہرو تو
میں اپنے خوں میں نہا کر ذرا نکھر جاؤں

●

یہ حرفِ چند بھی اک عمر کی کمائی ہیں
کہ غربتیں ہی وراثت میں ہم نے پائی ہیں

●

وہ کج کلاہوں کی بستیاں ہیں
وہاں نہ لے چل میں ننگے سر ہوں

●

میں نے اک بوند جو مانگا تو عجب قحط پڑا
خون بازاروں میں جیسے کبھی بکتا ہی نہ تھا

یہ مثالیں حوا کی بیٹیوں پر صدیوں سے جاری ظلم وستم کی کچھ تصویریں ہیں جن کی پرورش ومحافظت اونچے شملے والے لوگ قانون، مذہب، تہذیب اور روایت کے نام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ عشرت آفرین کا شدید ردِعمل اسی جابرانہ سسٹم کے خلاف ہے جسے ان کی حق شناس تخلیقی شخصیت نے دلکشی اور ہنرمندی کے ساتھ اپنے عہد کی جمالیاتی دستاویز بنا دیا ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

ملکہ نسیم

ملکہ نسیم شاعراتِ اردو کی صف میں ایک جانا پہچانا اور معروف نام ہے۔ان کی ولادت ۱ر جنوری ۱۹۵۴ء میں الہٰ آباد میں ہوئی۔سید مجاہد حسین کی بیٹی ہیں جو محلّہ کراری سادات ضلع الہٰ آباد کے رہنے والے تھے،ان کی ملازمت پولس ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔ادبی اور شعری ذوق بہت پختہ تھا اور اچھے داستان گو بھی تھے۔ملکہ نسیم کے دادا سید وصی حیدر رضوی نظامِ دکن کے لیگل ایڈوائزر تھے۔ مایہ ناز ناقد احتشام حسین رشتے میں ان کے خالو تھے۔ ملکہ نسیم نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔مشاعروں میں بھی خوب مقبول ہیں اور اس سلسلے میں پاکستان کے ساتھ ساتھ کئی خلیجی ممالک کا سفر بھی کر چکی ہیں ۱۹۹۲ء میں پاکستان کے سفر کے دوران 'نوائے وقت' نے انہیں 'سرحد کے اس پار کی پروین شاکر' کے خطاب سے نوازا تھا۔دو شعری مجموعے ان کی تخلیقی مسافت کی جمالیاتی دستاویز ہیں۔'دوپہر کا سفر' ۱۹۹۲ء میں اور 'آج کا موسم' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئے۔ان کی دونوں کتابیں اتر پردیش اردو اکادمی سے ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں اور راجستھان اردو اکادمی نے بھی ملکہ نسیم کو ان کی مجموعی خدمات پر اپنے ایوارڈ سے ۱۹۹۵ء میں نوازا ہے۔وہ اکادمی کے رسالہ 'نخلستان' کی ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۲ء تک مدیر رہیں ۱۹۸۰ء کے آس پاس ابھرنے والی شاعرات میں ان کا نمایاں مقام ہے۔

عصری رجحانات اور کلاسیکی تغزل کا خوب صورت امتزاج ملکہ نسیم کی غزلوں کی شناخت ہے۔ان کی غزلیں جذبات کی رنگینی،نسائی وقار اور بیان کی سبک روی سے عبارت ہیں۔ ماضی کی یادیں،حال کی بے یقینی اور مستقبل کے خوش آئند خواب ان کے موضوعات ہیں۔ تجربے کی نیرنگی

Scanned with CamScanner

اور خیال کی تازگی کے ساتھ کلاسیکی رکھ رکھاؤ ان کی اشعار کا اہم وصف ہیں۔ بنیادی طور پر ملکہ نسیم رومانوی احساسات کی شاعرہ ہیں اور صنفِ غزل عشق کے متعلقات سے ہی عبارت ہے۔ جہاں تخئیل کی پرواز نت نئے جہانوں کی سیر کرتی ہے۔تب ہی تازگی سے بھرے تجربے شعر کا روپ لیتے ہیں۔ ایک شاعرہ کے لئے اپنے جذبے کے وفور کو تحمل اور شائستگی کے ساتھ غزل میں پیش کرنا کسی امتحان سے کم نہیں ہوتا کہ لفظوں سے رنگ بھی چھلکے اور نسائی وقار پر آنچ بھی نہ آئے۔ ملکہ نسیم کے عشقیہ جذبے نسائی اظہار کی تہذیب سے آراستہ ہیں:

●

کر گئیں موجیں شرارت جب بھی لکھا تیرا نام
ریت پر جتنی لکیریں تھیں وہ سب مل جل گئیں

●

ہم نے یہ سوچ کے چھیڑا تھا فسانہ گل کا
اس بہانے ہی ترے ذکر کا پہلو نکلے

●

ہوائیں کرتی ہیں سرگوشیاں سی آنگن میں
نہ جانے آئیں گے کس کے قدم چراغ جلے

●

عمر گزری اک نگاہِ لطف کی امید میں
ہم کو اپنے حوصلوں کی یہ ادا اچھی لگی

●

میں کسی اور کو دیکھوں بھی تو دیکھوں کیسے
اس کے خوابوں کی ان آنکھوں پہ نگہبانی ہے

Scanned with CamScanner

یہ کون آیا ردا خوشبوؤں کا اوڑھے ہوئے
میں جشنِ ہجر مناؤں کے وصلِ یار کروں

●

وہ لڑکیاں کہ جو لگتی تھیں سادہ تحریریں
پڑھی گئیں تو انوکھی پہیلیاں نکلیں

●

ہر دور کا جو عکس ہے وہ آئینہ ہیں ہم
تخلیقِ کائنات کا اک سلسلہ ہیں ہم

ان اشعار میں نازک نسائی جذبے ہیں جن میں رومان کا رنگ تھرتھرا رہا ہے ساتھ ہی نسائی وجود کو ہر عہد کی تہذیب کا آئینہ بھی کہا ہے اور تخلیقِ کائنات کا اک سلسلہ بھی قرار دیا ہے۔

اس میں عورت کی عظمت کی تصویریں ہیں کہ وہ نہ صرف تہذیب بلکہ تخلیق کی علامت بھی ہے۔نسائی اظہار کا مفہوم یہ نہیں کہ عورت بس اپنے رومانی جذبہ وکیف کو ہی پیش کرے بلکہ توانا نسائی اظہار کو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ زندگی اور زمانے سے بھی مربوط ہونا چاہئے کہ اس کی دیدۂ بینا نے کائنات کو کس زاویے سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا، زندگی کے کن کن پہلوؤں کی طرف اس کی توجہ ہے۔اسی مقام پر اس کے روشن اور بیدار شعور کی پرتیں کھلتی ہیں۔ملکہ نسیم نے بھی زندگی اور ماحول سے اخذ کئے تجربوں کو زبان دی ہے جس سے ان کے خیال کی وسعت اور تازگی کا پتہ چلتا ہے۔نسائی فکر کا یہ احتجاجی رنگ دیکھئے :

مرے ہر فیصلے پر مہر تیری
مری ہر سانس جی سرکار کر دی
بکھیرا پھر سمیٹا پھر بکھیرا
شکستہ ربط کی دیوار کر دی

Scanned with CamScanner

خود آیا صبح کا اخبار بن کر
مری شہرت پسِ دیوار کر دی

●

آزمائش بال و پر کی کرتے رہنا ہے ضرور
جب خلش دل میں اٹھے تب آشیانہ چھوڑ دے
بیچنے پڑتے ہوں جس جا اپنی چشمِ تر کے خواب
ہے یہی بہتر کہ وہ در وہ ٹھکانا چھوڑ دے

تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت ،سیاسی ریاکاری ،منافقت اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ جو عصری زندگی کا منظرنامہ بنے ہوئے ہیں ،ان کے اشعار میں بھی کہیں کرب آمیز انداز میں تو کہیں طنز کی چبھن کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کریں :

یہ زندگی وہ کڑی دھوپ ہے تبسم یہاں
نہ جانے کتنے ہرے پیڑ سوکھ جاتے ہیں

●

زندگی تجھ سے تو پانا تھا ہمیں آبِ حیات
زہر کیسا یہ رگ و پے میں اترتا جائے

●

بکھر چکے ہیں صحیفے پرانی قدروں کے
ڈھلے ڈھلے سے ہیں احترام کے سائے

●

ہزاروں مسئلے، پرکھوں کا قرضہ فاقہ کی
خود اپنے آپ میں ہر شخص اک قبیلہ ہے

Scanned with CamScanner

لیے ہوئے ہوں میں کشکول خالی ہاتھوں میں
امیرِ شہر کا اب کتنا انتظار کروں

●

کبھی ہم سے پڑھی جاتی نہ تھیں چہروں کی تحریریں
مگر اب یہ کتابیں کس قدر آسان لگتی ہیں

عصری زندگی کی تلخیوں کے بیان میں ملکہ نسیم نے مذہبی تلمیحات کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔ آج بھی خیر اور شر کے درمیان شدید معرکہ آرائی ہے۔ ایسے میں ہمیں تاریخِ کربلا کو یاد رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ کہ ہم اسلاف کے کارناموں کو بھلا کر خود اپنے ہاتھوں اپنی تہذیب اور تاریخ کو پسپا کر رہے ہیں۔ شاعرہ نے اپنے اضطراب کو تاریخ آشنا حوصلوں سے آمیز کر دیا ہے کہ کارزارِ حیات میں سر بلند رہے:

صحرا کی دھوپ، پیاس کی شدت کا غم نہ تھا
ہاں اضطراب تھا تو سروں کی رداؤں کا

●

رہی ہے جھوٹ کی کوشش ہر اک زمانے میں
سجا کے نیزوں پہ سچائیوں کے سر رکھنا

●

لہولہان ان ہی حق کی شاہراہوں پر
اسیر ہی نہیں نیزوں پہ سر بھی چلتے ہیں

●

صداقتوں کے امیں بن کے گھر سے نکلے ہو
یزیدِ وقت سروں کو قلم کرے گا ضرور

●

دے دے اعزاز جبیں کو میری
کوئی سجدہ تہہِ خنجر دے دے

Scanned with CamScanner

●

شدتِ تشنہ لبی آج کہاں لائی ہے
پیاس صحرا کی سمندر میں اتر آئی ہے

ملکہ نسیم کی غزلوں میں گھر اور سفر کے تلازمے لائقِ توجہ ہیں۔ گھر کہ پناہ گاہ ہے، جائے سکون ہے، رشتوں کا ادارہ ہے جس سے ہر انسان جذباتی طور پر وابستہ ہوتا ہے۔ عورت کے لیے گھر خواب بھی ہے اور اس کی جنت بھی۔ سفر زندگی کے تحرک کا آئینہ ہے، تجربوں کا سلسلہ ہے، دوست اور دشمن کی پہچان اور پرکھ کا ذریعہ بھی ہے اور اپنی ذات کی آزمائش بھی۔ گھر سے متعلق شاعرہ کے احساسات جیسے کربِ ذات کی صورت ظاہر ہوتے ہیں:

نظر میں یادوں کے منظر سمیٹ کر رکھنا
میں جیسا چھوڑ کے آئی ہوں ویسا گھر رکھنا

●

نہ پڑھ لے کوئی تحریریں تمہارے زرد چہرے کی
در و دیوار گھر کے شوخ رنگوں سے سجا رکھنا

●

ہجر موسم ہے برستا ہے لہو آنکھوں سے
ہم نے گھر چھوڑ کے جانے کی سزا پائی ہے

●

بکھرتے مٹتے سے کچھ نقش تھے سرِ دیوار
ہمارے گھر میں تھا لے دے کے بس یہ سرمایہ

●

آتا ہے ہمیں خوف ہر اک شام و سحر سے
ہم گھر نہیں جاتے کبھی تنہائی کے ڈر سے

●

Scanned with CamScanner

جل اٹھتی ہیں وہ دل کے منڈیروں پہ سرِ شام
یادیں جو بچا لائے ہیں جلتے ہوئے گھر سے

●

ایک مدت بعد جب پھر اپنے گھر لوٹوں گی میں
اس کی بے تابی درو دیوار سے پوچھوں گی میں

●

یہ حصارِ در و دیوار نہ دے
پالنے والے مجھے گھر دے دے

پرسکون گھر کا خواب صرف تبسم کا ہی نہیں آج کے ہر حساس انسان کا المیہ ہے۔ بھاگتی دوڑتی زندگی نے اور شہر در شہر کے بسیرے اس سے ماضی کا وہ گہوارہ چھین لیا ہے جہاں معصومیت اور بے فکری کا راج تھا۔ جہاں الجھنوں اور مسئلوں سے نپٹنے کے لیے سایہ دار شجر کی صورت پیارے پیارے دل سے جڑے رشتے تھے۔ جنہیں شہری زندگی کا مصنوعی پن اپنا لقمہ بنا چکا ہے۔ جس کی یادیں سفر میں بھی بیقرار رکھتی ہیں۔ ملکہ تبسم نے اپنے مجموعہ کا نام 'دوپہر کا سفر' رکھا ہے۔ یہ نام علامت ہے وقت کی کڑی دھوپ میں زندگی کے سفر کا۔ دوپہر کے بعد شام آتی ہے جب پرندے بھی اپنے آشیانوں میں لوٹ آتے ہیں۔ لیکن شاعرہ ابھی سفر میں ہے، شام کے انتظار میں، واپسی کا خواب پلکوں میں بسائے، اپنے تھکے ہارے وجود کی خاطر گھر کے سکون کی آس لیے، دوپہر کو صرف ایک پڑاؤ سمجھتے ہوئے۔ ان کے اشعار میں پرندہ بھی اپنے اوصاف کے سبب رمزیہ انداز میں نظر آتا ہے:

دھندلکا شام کا چھانے لگا ہے، سوچتی ہوں
کہ اس سمئے تو پرندے بھی لوٹ آتے ہیں

●

جھاڑیں گے ذرا رک کے تھکن اپنے پروں کی
یہ سارے پرندے ابھی لوٹے ہیں سفر سے

●

Scanned with CamScanner

ذہن کی دیوار پر اترے ہیں ماضی کے پرند
خواہشوں کے پھر کسی نے چھت پہ دانے رکھ دئے

●

میں سوکھی ڈال ہوں لیکن تمہاری یادوں کے
پرند آکے سرِ شام بیٹھ جاتے ہیں

●

نہ ٹوٹ جائیں کہیں حوصلے اڑانوں کے
قفس سے دور پرندوں کے بال و پر رکھنا

●

فصیلِ شہر پہ ٹھہرے ہیں اجنبی سے پرند
یہ لگ رہا ہے کہ موسم بدلنے والا ہے

●

پر والے سب پرند تو اڑ جائیں گے تبسم
کیا ہوگا پنکھ ٹوٹی ہوئی فاختاؤں کا

بہر کیف ملکہ تبسم کی غزلوں میں زندگی کے مختلف رنگ بکھرے ہوئے ہیں جوان کی فکر اور خیال کی پرواز کا خوب صورت اور پر کیف منظر نامہ ہیں۔ مترنم لفظوں کا استعمال ان کی غزلوں کو نغمگی بھی بخشتا ہے اور پر کیف بھی بناتا ہے۔ عہدِ حاضر کی وہ ایک کامیاب شاعرہ ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

نسیم سید

اردو کی نئی بستیوں میں آباد خاتون قلم کاروں میں ایک نمایاں اور معتبر نام نسیم سید کا بھی ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۴۷ء میں الہٰ آباد میں ہوئی۔ ہندوستانی مٹی میں گندھی، پاکستان کی ہواؤں میں پلی بڑھی یہ شخصیت اب دیارِ مغرب میں مقیم ہے۔ نسیم سید کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آکر ان کی شاعرانہ شخصیت کو مقبول بنا چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'آدھی گواہی' اور دوسرا 'سمندر راستہ دے گا' ان کے تخلیقی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے نظم اور غزل دونوں کو نئے رنگ اور آہنگ سے آراستہ کیا ہے۔ ان کے موضوعات صرف نسائی وجود کا ہی احاطہ نہیں کرتے بلکہ ان کی دیدہ وری کائناتی صداقت کو نظم میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہے۔

ان کی غزلوں کا افق نسائی جذبہ و فکر کا خوب صورت ترجمان ہے۔ جس میں تازگیِ خیال اور جمالیاتی شعور کے ستاروں کی دل فریب جگمگاہٹ ہے۔ نسائی زندگی کے مختلف رنگ اپنی سچائی کے ساتھ ان کی غزلوں میں جلوہ گر ہیں۔ گھر، سماج اور معاشرے کی لازم کڑی ہونے کے باوجود عورتوں کو حاشیے پر ہی ڈالے رکھنے کا مرد اساس تہذیبی رویہ انہیں دکھ دیتا ہے۔ انہیں خبر ہے کہ زندگی کے تہذیبی، تمدنی، علمی اور ادبی ڈھانچے کی تشکیل میں مرد اور عورت دونوں برابر کے حصہ دار ہیں کہ یہی آئینِ فطرت بھی ہے۔ لیکن صنفِ نازک کے لیے زندگی کی راہیں تنگ کردی جاتی ہیں۔ تاجوری اور مسند نشینی مردوں کے بخت میں لکھی ہے۔ عورتوں پر تو ان کی تابع داری اور جی حضوری ہی لازم ٹھہرائی گئی۔ یوں باضابطہ مائیں اپنی بچیوں کی ذہنی تربیت میں بھی ان کے اصولوں کو پیش نظر رکھتی رہیں۔ اس طور پر یہ سلسلہ صدیوں سفر کرتا نسل در نسل منتقل ہوتا ہوا تاریخ بن گیا۔ حیرت ہے

Scanned with CamScanner

کہ کسی ماں نے مزاحمت یا احتجاج کی کوئی کوشش نہیں کہ شاید اس لیے کہ وہ محض ایک عورت تھی کہ مردوں کے خود ساختہ جبریہ اصولوں کے خلاف آواز اٹھانے کا تہذیب نے اسے حق ہی نہیں دیا تھا۔لیکن بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں شاعرات نے نہ صرف پدری معاشرے پر سوالات اٹھانے شروع کیے بلکہ اپنے احتجاج اور مخالفت کو خوب صورتی سے لفظوں کا پیکر بھی عطا کیا۔نسیم سید کے اشعار اس ضمن میں دعوتِ فکر دیتے ہیں :

ٹوٹ جاتے ہیں بکھرنے نہیں دیتے خود کو
ہم نے ماؤں سے وراثت ہی عجب پائی ہے

●

تربیت ہی ہمیں ماؤں سے ملی ہے ایسی
جسم صحرا ہو ،مگر ہونٹ نہ پانی مانگے

●

ہماری آنکھ کے حلقے ریاضتوں کے گواہ
ہمی خرابیٔ قسمت کے ذمہ دار ہوئے

●

ہوا کے زہر نے سینچا ہے میرا ذوقِ نمو
تمام تازہ ہواؤں سے نیم جاں ہوں میں

●

عجب عجب سے سوالوں کی دل کو دہشت تھی
یہ اس کے لہجے میں آج اتنی کیوں مروت تھی

●

میری ہستی کو وہ جیسے چاہے ویسے حل کرے
ضرب دے مجھ کو کبھی تقسیم کر جائے مجھے

Scanned with CamScanner

حسرتِ تعمیر میں مٹی مری برباد ہو
جرأتِ اظہار دیواروں میں چنوائے مجھے

●

اور پھر ایسی تصویروں کے بعد ان کے بدلتے ہوئے مزاج کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جہاں ان کا فکری شعور ایسے حالات پر سوال کھڑے کرتا ہے۔ جرأت اظہار کے یہ نمونے دیکھئے:

مری ڈور تھی ترے ہاتھ میں، تو کھلی فضاؤں سے فائدہ
مرے پاس بھی ہیں سوال کچھ تو بپا تو یومِ حساب کر

●

سو پھر بربادیِ احوال پر تکرار کیا کرتے
نمک کھایا تھا ہم نے عشق کا انکار کیا کرتے
ستم ہنس ہنس کے سہنے کو ہمارا دم غنیمت ہے
اگر ہم ہی نہ ہوتے آپ پھر سرکار کیا کرتے

●

ہمارے حق میں دلائل پہ داد ملتی ہے
ہمارے حق میں مگر فیصلہ نہیں ہوتا

●

اور بھی قرض ہیں تحریر کے اے صاحبِ علم
اک فقط تذکرۂ عشق نہ تحریر میں رکھ

●

اب کے پھاڑا وہ ورق لکھ کے جو سوچا بھی نہ تھا
اب کے سیکھا ہے سبق وہ کہ خدا جانتا ہے

●

Scanned with CamScanner

جواب دوں ترے لہجے میں دل یہ کہتا ہے
میں چپ رہوں یہ تقاضہ مرے وقار کا ہے

اسی نسائی وقار کی سلامتی نسیم سید کے پیشِ نظر ہے۔ اس لیے مدھم لیکن چبھتے ہوئے لہجے میں معاشرے کے زخم زخم سچ کو دکھاتی ہیں۔ شاعرہ اس مزاحمت اور حوصلے کا سبب بھی ان ہی حالات کو ٹھہراتی ہیں جو جبر اور استحصال کا زائیدہ ہے۔ اشعار دیکھئے:

وہ چھانٹتے رہے شاخ اور سایہ دار ہوئی
یہی تو بات بہت ان کو نا گوار ہوئی
ڈبویا اتنا کہ پیراک کر دیا مجھ کو
یہ دشمنی تو مجھے خوب ساز گار ہوئی
بدن تو کھاد ہوا ہمتیں تو صرف ہوئیں
مگر یہ ہے کہ مری فصل شان دار ہوئی

●

مدافعت نے یہ پرواز دی ہمیں صیاد
تو مار مار کے پتھر ہمیں اڑاتا رہا

●

مجھے خبر تھی ترے تیر میری تاک میں ہیں
سو اب اڑان میں میرا کہیں قیام نہیں

●

خزاں کے بیج زمینوں میں بو کے بیٹھے ہیں
اور انتظار کسی موسمِ بہار کا ہے

●

نسیم سید کے حوصلے کو نمو شکستہ اور فرسودہ روایت سے ملی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جس

Scanned with CamScanner

طرح شاخ شاخ چھانٹے جانے اور سایہ دار ہوتی ہے۔ بار بار ڈبوئے جانے کی کوشش سے ڈوب جانے کا خوف ہوا ہو جاتا ہے اور حالات اسے نبرد آزمائی کی قوت بخش دیتے ہیں۔ اسی طرح حوا کی بیٹیاں بھی حالات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن جاتی ہیں۔ اس لیے وہ یومِ حساب بپا کرنا چاہتی ہیں کہ تاریخ کی روشنی میں طئے کیے گئے سوالوں کا جواب ضروری ہے۔ نسائی وجود کو موم کی گڑیا، مٹی کی مورت اور جی حضوری کرنے والی غلام قوم سمجھے جاتے رہنے کے خلاف یہ ردِ عمل ہے ایک عورت کا، جس نے اپنی ہم صنفوں کے ساتھ برتے جانے والی تفریق اور اس کے درد کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اپنی فطری توانائی کو اس طور پر شعر میں سموتی ہیں کہ:

نقشِ محرومیٔ تقدیر کو تدبیر میں رکھ
سعیِ امکاں سے گزر شوق کو تعمیر میں رکھ

●

ان کے اشعار میں پیاس کا تلازمہ ان کے جذبہ واحساس کی رعنائی کی خوب صورت تصویر بناتا ہے۔ یہ پیاس جسم کے صحرا کی بھی ہو سکتی ہے، نا آسودہ جذبوں کی بھی اور محکوم طبقے کی بھی کہ جس کا مقدر لا حاصلی ہی رہا ہے۔ شعر دیکھیے:

لے کے چلو میں گرا دیں پانی
پیاس میں اتنی تو رعنائی ہو

●

کیا جانے کسی پیاس کے کام آنے کی راحت
کوزے میں سمندر نے سمٹ کر نہیں دیکھا

چلو میں پانی لے کر گرا دینا جذبۂ انکار کا مظہر ہے۔ آج کی عورت اپنے سماج اور معاشرے کے بوسیدہ اور جبریہ اصولوں سے انکار کرنے کی جرأت رکھتی ہے۔ وہ اپنے اوپر اٹھتی انگلیوں کے رخ موڑنا جانتی ہے۔ صدیوں کے گھسے پٹے رواجوں کے خلاف سوالات قائم کرنا جانتی ہے۔ مرد اساس معاشرے کی بے حسی پر چوٹ کرتی ہے کہ روایتی منظر نامہ میں بدلاؤ کی

Scanned with CamScanner

خواہش اس کے اندر سر اٹھا رہی ہے۔ یہی تفکر ان کے ذریعے تخلیق کیے گئے شعر وادب میں بہ حسن وخوبی شامل ہو رہا ہے۔ نسیم سید نے پاکستان سے ہجرت کر کے وادیِ مغرب میں اپنا آشیانہ بنالیا ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں مہاجر ہونے کا کرب بھی ملتا ہے۔ مثلاً:

جب زمینوں سے نئی کوئی تعلق ہی نہیں
کوئی پوچھے ہمیں ہجرت کی ضرورت کیا ہے

●

کچھ اپنے گھر کی فصیلوں سے بدگماں ہوں میں
کچھ عادتاً بھی مہاجر ہوں بے مکاں ہوں میں

●

نئی وضعوں کے گھر، رشتوں کی آرائش سے نالاں ہیں
سو رکھ دیں ساری تصویریں پسِ دیوار کیا کرتے

●

نسیم سید ایک باشعور اور حساس شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر کی دبازت کے ساتھ ساتھ جذبے کی فراوانی ملتی ہے۔ ان کی حقیقت پسندی انہیں اپنے ماحول اور معاشرے سے باخبر رکھتی ہے۔ اپنے تجربوں کو جذبہ واحساس سے آمیز کر کے دل آویز انداز میں لفظوں میں ڈھال دیتی ہیں۔ ان کی غزلیں نئے رنگ وآہنگ اور ان کی دیدہ وری کا پرکشش نمونہ ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

سکینہ ساجد پنہاںؔ

سکینہ ساجد پنہاںؔ ۱۹۸۰ء کے آس پاس ابھرنے والی شاعرات میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۵ را کتوبر ۱۹۵۷ء میں لاہور میں ہوئی۔ انہوں نے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور کراچی یونی ورسٹی میں پروفیسر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۴ء تک تدریسی فرائض انجام دیتی رہیں۔ سیاحت کے شوق نے مصر، یونان، سائپرس، اٹلی، جرمنی، انگلینڈ، سعودی عرب، ہندوستان، کنیڈا اور امریکا کی سیر کرائی۔ اب مستقل امریکا میں مقیم ہیں اور آرائشِ گل ان کا پسندیدہ شغل ہے۔ پنہاںؔ کی شاعری ابتدا ۱۹۶۷ء میں ہوئی لیکن ادبی رسائل میں اشاعت کا آغاز ۱۹۷۲ء سے ہوا۔ اب تک کے شعری سفر کے نمائندہ ان کے چار مجموعۂ کلام ہیں۔ 'پہلا' احساسِ ناتمامی' ۱۹۸۱ء میں دوسرا 'غزل سہیلی' ۱۹۸۸ء میں تیسرا 'آدھی رات کا پورا سچ' ۱۹۹۳ء میں اور چوتھا 'خود شکنی' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ ان میں دوسرا اور چوتھا مجموعہ صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ جب کہ پہلی اور تیسری کتاب میں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی شامل ہیں۔ شاعری کے علاوہ ان کی دل چسپی افسانہ نگاری اور مضمون نویسی میں بھی رہی ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ماہنامہ 'چہار سو' راولپنڈی نے نومبر دسمبر ۱۹۹۹ء خصوصی شمارہ نکالا۔ 'کتاب نما' دہلی نے اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ان کا گوشہ شائع کیا۔ ماہنامہ 'پرواز' لندن نے دسمبر ۲۰۰۲ء میں ان پر گوشہ نکالا۔ 'خود شکنی' کے لئے انہیں ۲۰۰۲ء میں اردو مرکز انٹرنیشنل نے ایوارڈ سے نوازا۔

پنہاںؔ عصرِ حاضر کی نمائندہ شاعرہ ہیں جن کی اہم شناخت ان کی غزلیں ہیں۔ ان کی

Scanned with CamScanner

غزلوں کا رنگ رومانی ہونے کے ساتھ ان کی فکری بالیدگی کا مظہر بھی ہے۔ شعری روایت کا رچا ہوا شعور اور لفظوں کا جمالیاتی آہنگ ان کا انفراد ہے۔ انہوں نے اپنے تخلص کا رمز اپنی شاعری میں بھر دیا ہے کہ بظاہر نثری ٹکرے اس شاعرانہ جمال سے آراستہ ہوگئے ہیں جو غزل کے حسن کو سادہ اور پرکار بنا دیتے ہیں۔ ان کی فن کارانہ پرکاری کا کمال یہ ہے کہ وہ احساس وفکر کے چھوٹے چھوٹے زاویوں کو جوڑتی ہوئی اتنا بڑا دائرہ بنا لیتی ہیں کہ اشعار میں معنی کا اک جہان سمٹ آتا ہے۔ شاعری ان کے نزدیک عبادت بھی ہے اور نقدِ ذات بھی۔ یہ اشعار ان کے شاعرانہ مسلک کا پتا دیتے ہیں:

نہیں پنہاںؔ یہ شہرت کا وسیلہ
عبادت جانتی ہوں شاعری کو

●

یہ مجھ میں ہے اسی میں میں ہوں پنہاںؔ
عجب رشتہ ہے میرا شاعری سے

●

سچ کہ تنقیدِ زندگی ہے ادب
شاعری نقدِ ذات ہے پنہاں

●

میں اک تتلی سی ہوں پنہاںؔ
مرے پر شاعری میری

●

یہ ہے پنہاںؔ کا نظریۂ شاعری۔ جہاں شاعرہ کا وجود اک تتلی سا ہے۔ تتلی فطرت کی حسین اور کومل تخلیق ہے۔ جو نزاکت، نفاست اور قدرت کی صناعی کا نمونہ ہے۔ تتلی نسائی وجود کا استعارہ بھی ہے کہ لطافت، نزاکت اور کوملتا کے اوصاف سے قدرت نے اسے بھی مالا مال کیا ہے۔ تتلی کی زندگی اس کے پروں سے مربوط ہے کہ پر شکستگی میں اس کی فنا پوشیدہ ہے۔ اسی کے خوش نما پروں

Scanned with CamScanner

سے پنہاںؔ اپنی شاعری کو تشبیہ دے رہی ہیں:

رم جھم رم جھم رت وہ دل پر جذبوں کی
کیسے کیسے کومل موسم بیتے ہیں

●

جب تری یاد کا بادل برسے
دلِ بستہ مرا کیسا ترسے

●

ذرا جو نیند سے چونکیں تو فطرت
سلائے خواب کا جھولا جھلا کر

●

پنہاںؔ کی شاعری خاموش احتجاج کی شاعری ہے۔ بڑی سادگی سے وہ اپنے فکر وخیال کو پیش کرتی ہیں۔ ان کے اشعار بین المتون قرأت کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں نسائی تفکر کا تیکھا اور کٹیلا رنگ ملتا ہے۔ مثلاً:

روکھی سوکھی پھانک رہی ہوں
تن کی گیا ہانک رہی ہوں
چھ گز لمبی ساری سے میں
سارے گھاؤ ڈھانک رہی ہوں

●

ان اشعار میں صدیوں پر محیط وہ نسائی کینوس ہے جہاں احساس وفکر کے اچھوتے رنگ اپنی خاموش زبان سے کرب کی داستاں سنا رہے ہیں۔ روکھی سوکھی پھانک کر تن کی گیا کو ہانکنا صدیوں سے عورتوں کا مقدر رہا ہے۔ گائے کے حوالے سے عورتوں کے لیے ہمارے سماج میں ان گنت محاورے رائج ہیں۔ جیسے اللہ میاں کی گائے، سیدھی گائے، دودھاری گائے وغیرہ۔ سب کی

Scanned with CamScanner

مراد عورت کے بے وقوفی کی حد تک سیدھا پن سے ہے۔ جو صرف اپنے مالک حکم پر سر جھکانا جانتی ہے۔ جسے خود اپنی ذات کا کوئی شعور نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیب کے قایدین کی نظر میں تانیثی وجود کی کیا حیثیت رہی ہوگی۔ صدیوں پہلے اسی سماجی روایت اور ذہنیت کے سبب امیر خسرو جیسے بزرگ شاعر نے بھی اسے 'بابل کے کھونٹے میں بندھی گیا' ہی کہا تھا۔ یہ آج بھی پورے برصغیر کا کڑوا سچ ہے جسے پنہاں اپنے شعر میں پیش کر رہی ہیں کہ کس طرح کے حالات سے عورتیں گزرتی ہیں اور زندگی بسر کرتی ہیں۔ دوسرے شعر میں شاعرہ چھ گز کی لمبی ساری سے سارے گھاؤ ڈھانکنے میں مصروف ہیں۔ یہ نسائی شخصیت کا تلخ تجربہ اور تہذیبی جبر ہے جو شعر میں رچ گیا ہے۔ بہ ظاہر نثری ٹکرے لیکن شاعرانہ جمالیاتی آہنگ سے بھرپور، دکھ کے غبار میں لپٹے، کتنی کہانیوں کو اپنے اندر سمیٹے تاریخ کا آئینہ بن گئے ہیں۔ بالیدہ نسائی شعور کی کچھ اور جھلکیاں دیکھئے:

تختۂ مشقِ زندگی ہوں میں
حرفِ تمہیدِ آگہی ہوں میں

●

علم اپنی حدوں کا ہے مجھ کو
اس قفس میں نجات ہے جاناں

●

نظر آتا ہے بس اتنا
ہے جتنی روشنی میری
فنا پر اپنی راضی ہوں
مگر یہ بے بسی میری

●

ان کے ہی تو پاؤں کی جوتی
جن لوگوں کی ناک رہی ہوں

Scanned with CamScanner

میں نہیں کچھ تو ہی سب کچھ
میں نے جانا میں نے مانا

●

ایک خوشبو ورائے نام ونشاں
ایک بے رنگ روشنی ہوں میں

ان اشعار میں صدیوں کے وہ زخم نہاں ہیں جو آج بھی رس رہے ہیں۔ بے بسی کی ان تصویروں کی سچائی سے انکار کہاں ممکن، جب لاچاری یہ رنگ دکھائے کہ 'میں نہیں کچھ تو ہی سب کچھ' جس کی کسک پنہاں کے سادہ لہجے میں سمائی ہوئی ہے۔ یہ درد مستقل ہے جس میں کانٹا چبھ کر ٹوٹ جانے کی ٹیس ہے جو شعر کی قرأت میں ظاہر ہوتی ہے۔ معاشرے اور سماج کے آگے نسائی ذات تختۂ مشق تو ضرور رہی ہے لیکن شاعرہ نے اسے حرفِ تمہیدِ آگہی بھی کہا ہے۔ کیوں کہ پنہاں کو اس کی خوب خبر ہے کہ:

ہر حقیقت پسِ حقیقت ہے
یہ حقیقت بھی جانتی ہوں میں

●

یہی آگہی شاعرہ پر زندگی کے در وا کرتی ہے اور پھر انہیں ایک عورت کی آنکھ سے دنیا دیکھنے اور پرکھنے کا تجربہ ہوتا ہے۔ اسی موڑ پر انہیں نسائی قوتِ فکر اور تحرک کا احساس ہوتا ہے۔ تب ان کی جمالیاتی فکر ایسے ہیرے تراشتی ہے:

کس طرح باز جرمِ تفکر سے آسکوں
جب مسئلہ ہو اپنی فنا و ثبات کا

●

اپنے وجود کے ثبات اور اثبات کے لیے شاعرہ دنیا کو اپنے طور پر انگیز کرنا چاہتی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے من میں بھی جھانکتی ہیں جہاں انہیں ایک نئی دنیا کی دید ہوتی ہے۔ اپنے طور پر

Scanned with CamScanner

جینے کی آرزو جب انگڑائیاں لے کر جاگتی ہے تو صدیوں کے بنے فرسودہ اور جبریہ اصولوں سے انکار کی آواز اشعار میں گونجنے لگتی ہے:

یقین مت کرو تم ذائقوں کا
مجھے چکھنے دو اپنی زندگی کو
آئینے سے غرض نہیں کچھ بھی
اپنی آنکھوں میں جھانکتی ہوں میں

●

ایک چھوٹی سی بات ہے پنہاں
دل میں اک کائنات ہے پنہاں
خود شناسی بھی ہے تو بس اتنی
مجھ میں اک اور ذات ہے پنہاں

●

ذات کا یہی عرفان اور خود شناسی کا شعور پنہاں کو جرأتِ اظہار بخشتا ہے۔ نسائی باب کی اپنے طور پر نئے سرے سے تشکیل دینے کی خواہش ان کے شاعرانہ وجدان کا حصہ بننے لگتی ہیں:

ادب سے دور ہٹ جائیں اندھیرے
ادا وہ سیکھنی ہے روشنی سے

●

درد بدن کے سب دل میں رہتے ہیں
اب اشکوں کے دریا الٹے بہتے ہیں

●

کنارے رکھ دیا دنیا اٹھا کر
چلے ہم زندگی کا دل چرا کر

Scanned with CamScanner

●

کشیدِ خوں کا پہلا رنگ پھولوں میں نمایاں ہے
ان ہی شاخوں پہ آئیں گے ثمر آہستہ آہستہ

●

دنیا کو کنارے رکھنے کی خواہش کے پیچھے یا اشکوں کے دریا الٹے بہنے کے پسِ پردہ خمی وجود کی کراہ سنائی دیتی ہے۔ جو مسلسل بے حاصلی کے درد سے گزر کر نئے انداز میں زندگی کرنا چاہتی ہے۔ خیال وفکر کی لہریں ان کی غزلوں میں یوں ہی رواں دواں ہیں۔ کہیں کہیں فلسفیانہ فکر کی روشنی یوں کوندا اٹھتی ہے جسے نسائی تفکر کی خوب صورت مثال کہہ سکتے ہیں:

سوچتی ہوں نہیں ہوں میں کچھ بھی
کچھ تو ہوں میں کہ سوچتی ہوں میں

●

اس شعر میں کر کے گارڈ کے مشہور قول کا عکس ہے کہ 'میں سوچتا ہوں اس لئے کہ میرا وجود ہے' پنہاں کو بھی یہی احساس ہے اس لیے ان کے یہاں تفکر کا گہرا اور دبیز رنگ نظر آتا ہے :

میں قطرے میں سمندر دیکھتی ہوں
پسِ منظر بھی منظر دیکھتی ہوں

●

آسان راستہ ہے یہ تسخیرِ ذات کا
سب راز چاہیے مجھے اس کائنات کا

●

بڑی وسعت ہے ہر ذرے میں پنہاں
تو پھر خود میں سمٹ کر دیکھتی ہوں

●

Scanned with CamScanner

اور وقت کی سفا کی پر یہ اظہار کہ:

آج ہم کوفے کے بازار میں ہیں
چادریں چھن گئیں جیسے سر سے

●

خود میں نے اپنے سارے پرندے اڑا دیے
دل اب مرا قفس تو نہیں خواہشات کا

●

وقت کے ہاتھوں ساری حقیقت عریاں ہے
کتنے کچے رنگ سجے تھے چہروں پر

●

یہ وقت کی سازش ہے کہ سورج کی شرارت
سائے مری دیوار کے اس پار بہت ہیں

نسائی احساسات پر مشتمل کچھ ایسے اشعار بھی قابلِ توجہ ہیں جس میں چڑیا عورت کا تلازمہ بن گئی ہے:

تنکے دانے چننا اس کی فطرت ہے
چڑیا کا احسان نہیں ہے بچوں پر

●

میں صبح و شام چڑیا کی طرح چنتی رہوں تنکے
مکمل ہو کبھی میرا بھی گھر آہستہ آہستہ

●

پنہاںؔ کی غزلوں کا انفراد ان کا نسائی تفکر کے انوکھے زاویے سے سجا سادہ اور پرکار اسلوب ہے۔ جہاں لفظوں کے ذرا سی الٹ پھیر سے معنی کے نئے گوشے اجاگر ہو جاتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:

وہ سب کچھ دیکھ لے گا روزِ محشر
مگر میں روز محشر دیکھتی ہوں

●

بسے گھر میں اجڑتے دل بھی دیکھے
سو دل میں گھر بسا کر دیکھتی ہوں

●

تسخیر ذات کرتی، کائنات کے اسرار کو اپنے پلو میں سمیٹتی تازہ دم، امنگوں اور تحرک سے بھری پنہاںؔ کی شاعری نہ صرف توجہ طلب ہے بلکہ نسائی کیفیات، تجربات اور تفکرات کی نادرہ کاری کے ساتھ ہی اپنے طرزِ ادا کے انوکھے پن سے چونکا دینے والی ان کی شاعرانہ جمالیات نسائی شاعری میں اہم اضافہ ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

حمیرا رحمٰن

۱۹۸۰ء کے آس پاس ابھرنے والی شاعرات میں حمیرا رحمٰن ایک نمایاں اور معتبر نام ہے۔ان کی زندگی مسلسل سفر سے عبارت رہی۔ان کی پیدائش پاکستان میں ہوئی اور تقریباً ۱۹ برس کی عمر میں لیبیا جانا پڑا۔کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد لندن چلی گئیں۔پھر کئی برس بعد وہاں سے امریکہ منتقل ہوگئیں۔اب شوہر کے ساتھ مستقل قیام امریکہ میں ہے ۱۹۸۴ء میں ان کا ایک مجموعۂ کلام 'اندمال' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔خوشی اس بات کی ہے کہ عمر کا بیشتر حصہ پاکستان سے باہر گزارنے کے باوجود ان کی فکر نے اپنی تہذیب اور زبان سے رشتہ برقرار رکھا اور اسے دیسی مٹی کی خوشبو سے آمیز کر کے اپنے جذبہ و خیال کا مظہر بھی بنایا۔

حمیرا رحمٰن بنیادی اعتبار سے رومانی شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری میں ماضی کی یادیں تہذیبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔انہوں نے نسائی جذبات ومحسوسات کو غزل کی رمزیت اور اشاریت کے سہارے بڑے دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔عورتوں کے دکھ سکھ کے ساتھ تہذیبی شعور اور عصری حسیت کا بھی انہیں ادراک ہے۔ان کے اشعار میں نسائی فکر کا ان چھوا اور انوکھا رنگ ملتا ہے۔کہیں کم سنی کے تجربے تو کہیں عورت کی تکمیلیت کے احساس کی پیش کش توجہ طلب ہے کہ زندگی کے لیے یہ تجربے نئے نہیں لیکن غزل کی تاریخ میں نئے ہیں۔مثلاً

میری انگلی کی انگوٹھی میں لگی پتھر کی آنکھ
اور دریچے میں سمٹ آئی محلے بھر کی آنکھ
ہم اسے اپنے لیے محدود سمجھے تھے مگر
لب کھلا اس چاند پر عرصے سے تھی گھر گھر کی آنکھ

Scanned with CamScanner

ان کے روشن ستارے کسی اور کی صحن میں جا گرے
راس آیا نہیں لڑکیوں کو یہاں آئینہ دیکھنا

●

جاتے جاتے لوگوں کو بیزار نہ کرنا بہتر ہے
اپنے دکھ ہم اپنی ہی دہلیز کے اندر بو جائیں

●

امّاں بھی کہتی ہیں حمیرا لڑکی کو سمجھاؤ
ایسا نہ ہو بارات آئے اور دلہن بول اٹھے

●

ان اشعار میں نوعمر لڑکی کے وہ تجربے ہیں جو ہماری سماجی روایت کا سچ ہیں۔ ان میں روشن ستارے کا کسی اور آنگن میں گرنا ایک المیہ ہے جو معاشرے کی دکھ بھری سچائی ہے۔ اسی طرح اپنے دکھ دہلیز کے اندر بونا، عرصے سے اس چاند پر گھر گھر کی آنکھ لگی ہونا یا پھر بارات آنے پر دلہن کا بولنا یہ سارے رنگ ہماری سماجی اور تہذیبی زندگی کا حصہ ہیں۔ حمیرا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسے شاعرانہ جمالیاتی حسن عطا کر کے شعر میں محفوظ کر دیا۔ عورتوں کے نازک اور لطیف احساسات کو بھی انہوں نے ندرت کے ساتھ شعر کا پیکر بنا دیا ہے:

آج اس راہ سے وہ گزرا ہے
آج میں فرش نہ دھونا چاہوں

●

وہ لمحہ جب مرے بچے نے ماں پکارا مجھے
میں ایک شاخ سے کیسا گھنا درخت ہوئی

Scanned with CamScanner

پہلا شعر نسائی نفسیات کا آئینہ دار ہے کہ محبوب کا نقشِ قدم مٹ نہ جائے، شدت جذبات کا اظہار سادہ مگر گہرا اور پر اثر ہے۔ دوسرا شعر نسائی وجود کی تکمیل کے کیف و سرور سے لبریز ہے۔ گھنا درخت ماں کا استعارہ بن گیا جس کی جڑیں زمیں کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہیں۔ جس کا کام ممتا کی گھنی چھاؤں فراہم کرنا ہے۔ یہ شعر عورت کے وجود کی عظمت کا مظہر ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی تک آتے آتے نسائی شعری اظہار کے منظر نامے میں قابلِ ذکر تبدیلیاں آچکی تھیں۔ جرأتِ اظہار کے الگ الگ رنگ اپنی رعنائیوں سمیت شعر کا حصہ بننے لگے تھے۔ شاعرات صرف محبوب کو پانے کی ہی نہیں بلکہ آزمانے کی خواہش بھی کرنے لگی تھیں۔ نسائی جبر کے خلاف سوالات قائم ہو رہے تھے۔ یہ ایک خوشگوار بدلاؤ تھا کہ شعور اور آگہی در کھل چکے تھے۔ اور شاعرات خود کو موم کی مورت کے بجائے ایک زندہ وجود کی صورت پیش کر رہی تھیں اور صدیوں کی بے اعتنائی کا جواب مانگ رہی تھیں۔ حمیرا کے اشعار اسی نئی سوچ پر مشتمل ہیں:

یہ دیکھنے کے لیے بار بار لوٹتی ہوں
کہ کاش تو مرے جانے پہ سوگوار ملے

●

کر کے تری محفل میں کسی اور سے باتیں
میں تو تری غیرت کو ذرا ڈھونڈ رہی تھی

●

جھوٹ لکھوں تو ساری بیاضیں تجھ سے ہی منسوب کروں
سچ بولوں تو لکھنے میں اوروں کا ذکر بھی آتا ہے

●

پہلے روشنیوں کی بستی اس نے ہم سے جیتی تھی
اب کے بار لگی پھر بازی اور وہ اس میں ہارا آنکھ

Scanned with CamScanner

اکھڑ گئے ہیں مرے دائروں کے سارے شجر
مقابلہ ہے نئے سورجوں کی حدت سے

●

نئے سورجوں سے مقابلہ کرتی یہ آج کی عورت ہے۔ جس کی بیاض میں اس کے اپنے جذبات اور کیفیات کے ساتھ پھیلی ہوئی دنیا اور اس کے واقعات و تجربات ہیں۔ جنہیں وہ اپنے زاوئے سے دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بھی اس کی نظر ہے، رشتوں کی ڈھہتی دیوار بھی اسے ملول کرتی ہے۔ کہیں زندگی کا فلسفیانہ پہلو تو کہیں الم ناک منظر بھی دکھائی دیتا ہے۔ مختلف ملکوں کا سفر بھی تجربہ بنتا ہے اور ذہن کے پردے سے بھولے بسرے گاؤں کے منظر بھی جھانکتے نظر آتے ہیں۔ غرض غزلوں کے وسیع کینوس پر مختلف رنگوں کے گل بوٹے بہار دکھا رہے ہیں۔ بے یقینی کی فضا اور دہشت کے منظر اس طرح حمیؔرا کے یہاں پیش ہوئے ہیں:

ہر ایک سو رہا ہے اپنی ایک آنکھ کھول کر
اب اعتبارِ زندگی ہے رت جگوں کے ہاتھ میں

●

شاید رات کا اگلا پہر بھی پچھلے پہر سے الگ نہیں
ڈھور مویشی چپ بیٹھے ہیں اپنے اپنے باڑوں میں

●

حمیؔرا لوگ تذبذب کی کشتیوں پہ رواں
ڈرے ہوئے ہیں کسی لہر کی شرارت سے

ہجرت کے حوالے سے چند اشعار دیکھئے:

پہچان مری گھر سے نہیں ہجرتوں سے ہے
یہ المیہ بھی ہونے لگا مجھ پہ فاش پھر

Scanned with CamScanner

•

یہ جال پھیل رہا ہے مری ہتھیلی پر
کہ ہجرتوں کا حوالہ ہے میری قسمت سے

•

ہر آئندہ لمحہ پہلے سے بڑھ کر حیران
ہجرت کرنے والوں کی پہچان پرانی ہے

اور جذبوں سے عاری ہوتے رشتوں پر یہ اداسی اور ملال کے رنگ جو حمیرا رحمٰن کی حساسیت کا پتا دیتے ہیں:

تعلقات کھلے آسمان جیسے ہیں
نہ قربتیں ہیں نہ ملنے کی آس شدت سے

•

دل کی عمارت بنیادوں کے بیچ سے اکھڑی ہے
اب ہر کوئی تعمیروں سے پہلے سوچے گا

•

اب یہ تعلق ریت ہوا تو اتنی حمیرا حیرت کیا
رشتوں کی بنیاد اٹھی تھی کچھ ہموار دراڑوں میں

•

اب چند اشعار ان شعری پیکروں پر جو شاعری کو رمز اور تہہ داری کے ساتھ ساتھ حسن اور اعتبار بھی بخشتے ہیں اور ان کے نسائی مزاج کی شناخت بھی ہیں:

صحنوں میں بارش کا چھینٹا پڑتے ہی
اینٹوں کا چہرہ کتنا شاداب ہوا

•

Scanned with CamScanner

صبا نے آنچل اتار پھینکا
کہ موسموں کے حجاب اتریں

●

یہ بھی اک حادثہ گزرا ہے خزاں کے ہاتھوں
پیڑ کا جسم ہے سائے کی ردا سے باہر

●

جب سے اس دیوار میں روزن ہوئے
جھانکنے والوں کے گھر روشن ہوئے

●

سب کو سطح آب پر کھلتے کنول اچھے لگے
کس نے دیکھی ہے حمیرا جھیل کی گہرائیاں

●

حمیرا رحمٰن ایسی ہی شاعرہ ہیں جن کی نظر سطح کے ساتھ ساتھ گہرائیوں کا جائزہ بھی لیتی ہیں۔ان کا متحرک شعور زندگی کے نشیب وفراز کا تجزیہ کرتا ہے۔وہ اپنے تجربوں کو شعر کا روپ دیتی ہیں۔زندگی کی تلخیوں کے ساتھ اس کے حسن کو غزل کے فن میں آمیز کرتی ان کی جمالیاتی ہنرمندی ان کے اشعار میں نمایاں ہے۔آج کے پل پل بدلتے عہد میں ان کا نسائی زاویۂ نظر اور اظہارِ فکر کا منفرد رنگ ان کی غزلوں کی اہم شناخت ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

شہناز نبی

شہناز نبی عصرِ حاضر کی ایک منفرد شاعرہ ہیں۔ ۲۰ ؍مارچ ۱۹۵۸ء میں کولکاتا میں ان کی ولادت ہوئی۔ کولکاتا یونی ورسٹی سے انہوں نے اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اب وہ اسی یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہیں۔ ان کی تخلیقی فکر شاعری، ڈرامہ اور ترجمہ نگاری کے علاقے میں اپنی جولانیاں دکھاتی ہے۔ تین شعری مجموعے اور متعدد کتابوں کی مصنفہ کے شعری سفر کا آغاز اسکول کے زمانہ میں ہوا۔ احساس کی نادرہ کاری اور لہجے کے انوکھے پن کے سبب مختصر عرصے میں ہی انہوں نے اپنے ہم عصروں کے درمیان اپنی واضح شناخت بنالی۔ غزلوں پر مشتمل 'بھیگی رتوں کی کتھا' اور نظموں کے نمائندہ مجموعے 'اگلے پڑاؤ سے پہلے' اور 'پسِ دیوارِ گریہ' ان کی شاعرانہ جمالیات کے مظہر ہیں۔

شہناز نبی کی تخلیقی توانائی غزل اور نظم دونوں صنفوں میں اظہار پاتی ہے۔ ان کی غزلیں نسائی تفکر کی خوب صورت ترجمان ہیں۔ ان کا اولین شعری 'مجموعہ بھیگی رتوں کی کتھا' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا جب کہ شاعرہ کی عمر محض بائیس برس کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں شامل تخلیقات ان کی ابتدائی شاعری کا نمونہ ہوں گی۔ اس لیے ان میں نوعمری کی جذباتی شدت تو جھلکتی ہی ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو نسائی ذات کے فکری زاویوں کی شناخت کا اصرار بھی موجود ہے۔ اس کی پہلی غزل نہ صرف توجہ طلب ہے بلکہ نسائی جہت کی روشن مثال بھی ہے :

●

عذابِ ہجر سہنے کے لیے دکھ کے کھنڈر میں ہو
کبھی میری طرح وہ بھی صداؤں کے بھنور میں ہو

Scanned with CamScanner

ہمیں شہنازؔ بس اس وقت تک صفحوں میں رہنا ہے
ہرا ہو جب تلک لہجہ، نمو جب تک ہنر میں ہو

یہ اشعار تاریخ میں اپنی موجودگی درج کراتے نئے نسائی شعور کا خوب صورت اظہار یہ ہیں۔ یہ آرزو کہ کبھی وہ بھی میری طرح دکھ سے آشنا ہواور صداؤں کے بھنور اسے بھی اپنے حصار میں لیں، ایک نیا تجربہ ہے۔ بہ حیثیتِ شاعرہ لہجے کی شادابی اور ہنر کی زرخیزی کے ساتھ اوراق پر موجود رہنے کا ارادہ ان کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ان کے بالیدہ شعور کے ایسے ہی فکری اور جمالیاتی نمونے قاری کی توجہ کھینچ لیتے ہیں۔نسائی وجود کی توانائی اور تیور کی چند مثالیں دیکھئے:

ہمیں بھی آتا ہے تخلیقِ کائنات کا فن
وہ ایک مٹھی زمیں دے جہان سے پہلے

●

سمٹے ہوئے پروں کو کسی دن میں کھول کے
اڑ جاؤں گی فضاؤں کے تیور ٹٹول کے
جی چاہتا ہے اک نئے انداز سے جیوں
ہستی کی تہہ بہ تہہ سبھی پرتوں کو کھول کے

ان کی غزلوں میں صدیوں سے حاشئے پر رکھی گئی عورت کا کرب ہے۔شہنازؔ کی حقیقت پسندی، تاریخی بصیرت اور جسارتِ بیان نے اسے عصرِ موجودہ کے نسائی منظر نامہ سے جوڑ کر دیکھا اور پرکھا ہی نہیں بلکہ شدید ردِعمل کے ساتھ مرداساس معاشرے اور تہذیب کے مروج اصولوں پر احتجاج بھی کیا ہے۔آج کے مشینی دور نے عورت اور مرد کے درمیان نازک اور لطیف رشتے بے حسی ، بے اعتنائی اور فاصلوں کی گرد سے غبار آلودہ ہو گئے ہیں۔ گھٹن اور تنہائی کا یہ درد تاریخ کا حصہ بھی ہے اور آج کی دل گداز سچائی بھی۔ان کے اشعار میں احساسات و تفکر کے رنگ نسائی وجود کے درد سے یوں آمیز نظر آتے ہیں:

میں کہ اپنی ذات میں اک پیاس کا صحرا رہی
کارواں در کارواں گزری مگر تنہا رہی

●

مرے خلوص کا اتنا سا بھی صلہ ہوتا
کبھی وہ مجھ سے مری طرح سے ملا ہوتا

●

بہت قریب تھا لیکن اسے پتا نہ لگا
مرے وجود میں کچھ ٹوٹتا ہوا نہ لگا

●

اپنی ہی دہلیز پر دستک سنیں اپنے لیے
پھر ہواؤں سے یوں ہی دن رات ہم الجھا کریں

●

خوابوں کی دیوار ہی گر گئی آنکھ کھنڈر کا رونا کیا
سارے بدن میں ہو کا عالم، دل کے نگر کا رونا کیا

●

تردید کریں بھی تو کیا مانے گا زمانہ
مجرم ہمیں ہر طور سے مانے گا زمانہ

●

اب اپنا ہر سلیقہ کیوں خطا کاری میں آتا ہے
کہ سچا عشق بھی طرزِ گنہ گاری میں آتا ہے

●

ہر سمت سے پتھر ہی پذیرائی کو آئے
جیسے کہ ترے شہر میں رسوائی کو آئے

Scanned with CamScanner

کیا سوچ کے فریاد رسی تم نے اٹھا دی
ہم ضبط کے مارے تو شکیبائی کو آئے

●

وہ جگمگاتا رہا میری روشنی سے مگر
میں اس کے نرم اجالوں کا لمس پا نہ سکی

غزل عشق سے عبارت ہے اور عشق ایک فطری جذبہ بھی ہے اور زندگی کا سلیقہ بھی۔ لیکن مشینی عہد اور صارفیت حاوی معاشرہ میں انسان کے دل میں پنپنے والا یہ نازک فطری جذبہ بھی بے حسی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ شہناز نبی پروفیسر کے عہدے پر اپنی ذمہ داری نبھانے کے ساتھ ساتھ مارکسی سیاست کے میدان میں بھی سرگرم رہی ہیں اس لیے ان کے تجربوں کی دنیا بھی وسیع ہے۔ ایک باشعور شاعرہ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی نسائی ذات کے احساسات کو الگ الگ رنگ بخشتی ہیں۔ آرزومندی، جذبے کی شدت اور رومانی ارتعاش سے لبریز چند اشعار دیکھئے:

پھولوں کی طرح کھل کے ہنسوں پل میں بکھر جاؤں
خوشبو سی کسی یاد کے آنگن میں ٹھہر جاؤں
گم نام جزیرہ ہوں ، تو دریافت مجھے کر
دے نام کوئی ایسا کہ پہچان سے بھر جاؤں

●

وہ جگمگاتا رہا میری روشنی سے مگر
میں اس کے نرم اجالوں کا لمس پا نہ سکی

جب تمناؤں کا حصول ممکن نہ ہو، بے یقینی کا صحرا سرابوں کا سمندر لگے اور نازک رشتوں میں قرب کی سرشاری کے بجائے فاصلوں کی خاک اڑنے لگے تو روح کا اضطراب اشعار میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے:

Scanned with CamScanner

گزر ہی جا مری عمرِ رائگاں یوں ہی
دلوں کے بیچ کوئی معاملہ نہیں نہ سہی

●

تمہاری یاد کا سودا نہ کر سکیں آنکھیں
حسیں تھی نیند مگر رت جگے بھی کیا کرتے

●

عجب یہ ہجر کی شب تجربے میں آئی ہے
ستارے جلتے رہے آسمان بجھنے لگا

●

سبھی بلند اڑانوں میں یاد آتی رہی
وہ ایک شاخ کہ میں جس پہ پر بچھا نہ سکی

ان اشعار میں بے حاصلی کا دکھ نمایاں ہے۔ہجر کی شب کا یہ انوکھا تجربہ کہ ستارے جلتے رہیں اور آسمان بجھ جائے یا زندگی کے وسیع آسمان پر اڑانیں بھرتے ہوئے اس ایک شاخ کا خیال آنا جس پر ٹھہر کر تھکن اتارنے کا موقع تک نہیں ملا۔ان اشعار میں ملال کی شبنمی دھند میں لپٹے ہوئے احساس ہیں لیکن شاعرہ اس موڑ پر رکتیں نہیں بلکہ ان کی تخلیقی توانائی زندگی کی تلخیوں کے درمیان راستہ بنانے کا ہنر جانتی ہے۔ان کے یہاں مرد اساس رائج اصولوں کے خلاف احتجاج ہی نہیں بلکہ انکار کا نظریہ بھی ملتا ہے۔وہ نسائی وجود کے خلاف صدیوں پرانے سسٹم کو بدلنے کا شعور رکھتی ہیں۔ فرسودہ روایت کے خلاف ان کی باغی فکر جارحانہ نہیں بلکہ شائستگی اور وقار کے ساتھ وہ نسائی وجود کی انفرادی شناخت پر مصر ہیں۔ان کی جرأتِ فکر کا اظہار ان اشعار میں نمایاں ہے :

کلبۂ جاں کی اداسی میں سنبھل کر آئے
اس کو آنا ہے تو انداز بدل کر آئے

Scanned with CamScanner

وہ جو چاہے تو کسے ہم کو کسوٹی پہ مگر
بے خطر ہم بھی تو شعلوں میں ہیں جل کر آئے

●

اسے کہہ دو کہ ہرگز رخ کرے نہ دشتِ وحشت کا
کہ اب یہ قطعہ بھی اپنی عمل داری میں آتا ہے

●

لو ہم نے بھی چاکِ جگر سی لیے اپنے
لوٹا دو اسے جو بھی مسیحائی کو آئے

●

بابِ احساس کے کھلنے پہ ندامت کیسی
موج سرکش ہے تو ساحل پہ اچھل کر آئے

●

حصارِ زیست کے آگے بھی مرحلے ہیں کئی
ابھی نہ مجھ کو اسیرِ صدائے جادہ کرے
زمیں کے نخرے جو کرنے چلا ہے کہہ دو اسے
جو ہو سکے تو خلا کو بھی آدھا آدھا کرے

●

ترے بازار میں یوسف کی قیمت ہم ادا کرتے
مگر صورت ہے لاثانی نہ سیرت ہی مثالی ہے

حسن صورت اور سیرت کی تلاش کا مرکز اب تک عورت ہی رہی ہے لیکن پہلی بار شہناز نبی کا مطالبہ صنفِ مخالف سے ہوا ہے۔ انکار کا یہ خوب صورت رنگ کہ آج کا یوسف نہ صورت میں لاثانی ہے نہ سیرت میں مثالی ورنہ قیمت تو ادا کر ہی دیتی یا پھر کلبۂ جاں کی اداسی میں سنبھل کر اور انداز بھی بدل کر آنے کا حکم اور پھر یہ اعلان کہ دشتِ وحشت اب صرف مردوں کا اجارہ نہیں بلکہ اس

Scanned with CamScanner

کے ایک قطعہ پر طبقۂ اناث کی عمل داری بھی ہے۔ یہ نئے افکار ہیں جو شہنازؔ کی غزلوں کا روشن پہلو ہیں۔ کمال یہ ہے کہ تیکھے وار کرتے ہوئے بھی ان کا لہجہ شعری روایت سے مربوط رہتا ہے۔ مثلاً:

ابھی تک ہم اکیلے رو رہے ہیں شب گزیدوں پر
اے شہرِ بے بصر تو کب عزاداری میں آتا ہے

●

پتا کرو کہ کہاں پر رکھا ہے زخم نیا
کیوں التفات مرے حق میں حد سے زیادہ کرے

●

ابھی تک لبوں پہ ہے قفل یاں، ابھی تک نگاہوں پہ قدغنیں
ترے حق پرستوں پہ آج بھی وہ سزائے موت بحال ہے

●

شہنازؔ نبی کی غزلوں کا غنائی آہنگ مسحور کن ہے جس میں ہندی لفظوں کی آمیزش نے رنگ چوکھا کر دیا ہے۔ اسی کے سبب کئی اشعار پیکر تراشی کی دلکش مثال نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار پیش ہیں:

ہر ایک شاخ بلاتی رہی پسارے ہاتھ
شجر کی گود سے لیکن اتر گئے پتے

●

اتار لے گیا فصلیں چڑھاوٗ دریا کا
بہت عجیب تھا اب کے سبھاوٗ دریا کا

●

اس ویرانے میں سائے کا ساتھ نبھانے کی مت سوچ
میں گرتی دیوار ہوں مورکھ پیٹھ ٹکانے کی مت سوچ

●

Scanned with CamScanner

اب اس آنگن کی دیواریں اپنی عمر سی پختہ ہیں
جن پر کدو کی بیلوں کا جال بچھا سا رہتا تھا

●

ہم پر تو کسی روز نگہ اس کی پڑے گی
ہم سوختہ جانوں کو بھی بانچھے گا زمانہ

●

پھر سے تنہائی میں پھن کاڑھ لیا کرتی ہیں
اپنی دانست میں یادوں کو کچل کر آئے

●

ہر لمحہ مجھ کو ڈس گیا لیکن وہ نیل کنٹھ
کب آ سکا جو وقت کا دریا نتھارتا

بہ حیثیت مجموعی شہناز نبی کی غزلیں باشعور نسائی شخصیت کی فکر کی ترجمان ہیں۔ 'بھیگی رتوں کی کتھا' ان کی غزلوں کا واحد مجموعہ ہے۔ جس میں روز مرہ کی بولی اور محاوروں کا تخلیقی سطح پر خوب صورت استعمال شاعرہ کے جمالیاتی آہنگ کا مظہر ہے۔ تازگیِ فکر و احساس کے ساتھ وہ ہم عصر شعری منظر نامہ میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

●●

Scanned with CamScanner

عفت زریں

عفت زریں مشہور شاعر مشیر جھنجھانوی کی بیٹی ہیں۔ان کی ولادت ۱۰/اکتوبر ۱۹۵۸ء میں دہلی میں ہوئی۔انہوں نے ہائر سکنڈری جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے پاس کیا اور بی اے، ایم اے ،ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری دہلی یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ابھی دہلی یونی ورسٹی کے ایک کالج میں اردو کی تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔گھر کے علمی ادبی اور تہذیبی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔شاعری میں اصلاح انہوں نے اپنے والد سے لی۔شعر و ادب انہیں وراثت میں ملا جس میں انہوں نے اپنی انفرادی تخلیقی فکر کی آمیزش سے الگ ہی رنگ روپ دیا۔ان کا پہلا شعری مجموعہ 'بے ساحل دریا' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ نثر میں 'فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں' 'فنِ مضمون نگاری' اور 'انفاسِ غزل' کے نام سے مشیر جھنجھانوی کے کلام کو مرتب کیا ہے۔زریں کی شاعری کی ابتدا ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ان کی پہلی تخلیق غزل کے روپ میں 'آج کل' کے خواتین نمبر میں شائع ہوئی۔

عفت زریں عہدِ حاضر کی ایک باصلاحیت اور پروقار شاعرہ ہیں۔خانگی ذمہ داریوں اور تدریسی فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہنے کے ساتھ ساتھ تخلیق، تحقیق اور تنقید کے علاقے میں بھی ان کی فعال شخصیت کے نقوش روشن ہیں۔ان کی شاعری کے آغاز کا زمانہ اردو شعر و ادب کے جدید رجحانات سے عبارت تھا۔لیکن انہوں نے اپنے تخیل و افکار کو کسی تحریک یا رجحان کے تحت اسیر نہیں کیا۔ان کی نشو و نما ہی اردو کی تہذیب میں ہوئی تھی اس لیے انہوں نے قدیم شعری روایت کی صالح قدروں کے ساتھ نئی فکر و حسیت کی آمیزش سے اپنی راہ بنائی۔ان کی غزلوں کا فلک رومانی احساس و فکر کے ستاروں سے جگمگا رہا ہے۔ہم عصر نئی شاعری کے مثبت رجحانات بھی

Scanned with CamScanner

ان کی غزلوں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔نسائی تشخص کی خوب صورت مثالیں ان کے یہاں کچھ اس طرح ملتی ہیں:

ورق ورق میں سمو دے مجھے کتاب میں رکھ
میں زندگی ہوں مجھے وقت کے نصاب میں رکھ

●

مدت سے اپنی ذات کے تنہا سفر میں ہوں
خوشبو ہوں دل کی اور ابھی رہ گزر میں ہوں

●

خواب آنکھوں میں بسے رہتے ہیں پھولوں کی طرح
رات چپکے سے مرے دل میں اتر جاتی ہے

●

ہوا ہو پھول ہو خوشبو ہو یا دھواں تم ہو
مرے وجود میں بولو کہاں کہاں تم ہو

●

مہک مہک کے بکھرتی میں اس کے آنگن میں
وہ اپنے گھر کا دریچہ اگر کھلا رکھتا

●

عفت زریں کی غزلیں اپنے عہد کا آئینہ ہیں۔اجنبیت، نا آسودگی، بے حاصلی اور تنہائی کے موضوعات فکر کی تازگی کے ساتھ ان کے اشعار میں نمایاں ہیں۔ دلوں کے درمیان بڑھتے فاصلوں نے بھی تنہائی کے احساس کو فروغ دیا ہے اور ساتھ ہی مشینی زندگی کی بھاگ دوڑ نے انسان کے اندر بے حسی کی ایک کیفیت کو جنم دیا ہے۔جس کے نتیجے میں انسان کا جذبی اور اخلاقی زوال آج کی مشینی تہذیب کا المیہ بن گیا ہے۔عفت زریں کے یہاں یہ تجربے ان کے جمالیاتی شعور اور

Scanned with CamScanner

تخلیقی فکر کے توازن سے شعر کا پیکر بن گئے ہیں:

ذہن ودل کے فاصلے تھے ہم جنہیں سہتے رہے
ایک ہی گھر میں بہت سے اجنبی رہتے رہے

●

انجمن در انجمن تھی روح کی تنہائیاں
رونقِ محفل رہی اور خلوتوں میں بٹ گئی

●

ظاہر تو یہ ہے دل سے خفا تک نہیں کوئی
رشتوں کے ٹوٹنے کی صدا تک نہیں کوئی

●

اب دل کی بستیوں میں بھی وہ قربتیں کہاں
مشکل بہت تھے، شہرِ پناہوں کے فاصلے

●

گھر ہو محفل ہو یا کہ تنہائی
فاصلے اب کہاں نہیں ہوتے

●

حیران ہوں کہ مڑ کے کوئی دیکھتا نہیں
شاید مری صدائیں حصاروں میں قید ہیں

●

سایہ مرے وجود کی حد سے گزر گیا
اب اجنبی ہیں آپ، شناسائیوں کے بیچ

●

Scanned with CamScanner

یہی اجنبیت ، بے گانگی ، فاصلے اور تنہائی ہمارے عہد کا مقدر ہیں ۔ایک ہی گھر میں رہنے والے مصروف لوگ آپس میں مکالمہ قائم نہیں کر پاتے ۔روح کا سناٹا اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ فاصلے ہر جگہ پاؤں پسارے نظر آتے ہیں ۔شاعرہ نے بڑی خوب صورتی سے شناسائیوں کے بیچ اجنبیت ،دل کی بستیوں سے قربتوں کا غائب ہونا، گھر اور محفل گویا ہر جگہ فاصلوں کے بڑھتے سلسلے پر نظر ڈالی ہے ۔ایک حساس شخصیت ہونے کے سبب پرانی قدروں کی شکست و ریخت پر بھی وہ بہت دکھی ہیں ۔اس المیہ کو وہ انسان کے ذہنی اور روحانی زوال سے تعبیر کرتی ہیں ۔انہیں پرکشش ماضی کی یادیں مضطرب رکھتی ہیں ۔وہ گم شدہ ماضی جو صرف عفت زریں کی زندگی کا ہی سرمایہ نہیں بلکہ صدیوں کی تہذیب کا استعارہ ہے ۔پتھر کی علامت سے عہدِ ماضی کو منسلک کیا گیا ہے جو شاعرہ کی فکری گہرائی کا اشاریہ ہے:

پرانے وقت کے پتھر خرید لائے ہیں
ہم اپنے دور کا زیور خرید لائے ہیں

●

ریت کے پھول بھی تاریخ کا افسانہ ہیں
وقت پتھر کے سلوں میں بھی سمٹ جاتا ہے

●

نہ جانے کیا ہے کہ دل مطمئیں نہیں ہوتا
کشش عجیب ہے بوسیدہ یادگاروں میں

●

پتھر ہیں ہم تو جو بھی ہیں اپنی جگہ پہ ہیں
اس زندگی کی ایک تو پہچان ہم بھی ہیں

●

یہ دل ہے اور یہ ماضی کے پرکشش چہرے
اس آئینے میں تو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

Scanned with CamScanner

اسی دل کے آئینہ میں گم شدہ ماضی قید ہے۔ جس کی تصویریں عفت زریں کے اشعار میں متحرک ہیں۔ اپنے احساسات کے بیان کے لیے ان کی فکر نئے تلازمے اور نئے شعری پیکر تراشتی ہے جوانوکھے بھی ہیں اور دل فریب بھی۔ گو کہ ان کے اندر تجربوں کی تلخیاں ہیں پھر بھی قدیم شعری روایت کی آگہی کے سبب شاعرہ اسے غزل کے رمزیہ مزاج سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہیں:

دور تک ساحل پہ دل کے آبلوں کا عکس تھا
کشتیاں شعلوں کی دریا موم کے بہتے رہے

●

پتھر کے جسم، موم کے چہرے، دھواں دھواں
کس شہر میں اڑا کے ہوا لے گئی مجھے

●

دھوپ اور چھاؤں کی تحریر بنے گرد کے پھول
نقش بکھرے ہیں عجب وقت کی دیواروں پر

●

یہ سرخیاں کبھی ملتی نہیں گلابوں میں
لہو کا رنگ پیالوں کی زد میں رکھتے ہیں

●

خاک اب اڑنے لگی میدان صحرا ہو گئے
وقت کا طوفان دریاؤں سے پانی لے گیا

●

ہر ایک لفظ میں سوزش ہے آبلوں جیسی
کہ شمع جلتی رہی خود رگِ قلم کی طرح

Scanned with CamScanner

لبادہ اوڑھ کے تنہائیوں کا چلتے رہے
چراغِ راہ تھے سونی سڑک پہ جلتے رہے

●

صحرا میں دور تک بھی کوئی نقشِ پا نہ تھا
میرے سوا سفر میں کوئی دوسرا نہ تھا

ماضی کے ان دیکھے راستوں پر بھلا کون لوٹنا چاہے گا سوائے شاعرہ کے، کیوں کہ انہیں اپنا وقت اجنبی لگتا ہے۔ اسی تنہائی کے احساس نے ان کے یہاں یاسیت کو جنم دیا ہے۔ اور اداس لمحوں میں وہ خواب دیکھتی ہیں۔ لیکن خواب بنتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ وقت سارے نقش چرا لیتا ہے، سارے خواب اور ساری کہانیاں چھین لیتا ہے۔ جبر کے اس رنگ کو عفت زریں اتنے دلکش انداز میں پیش کرتی ہیں کہ ملال کی ہلکی دھند میں لپٹی ہوئی خیال کی جادوگری قابلِ دید بن جاتی ہے:

خواب آنکھوں سے زباں سے ہر کہانی لے گیا
مختصر یہ ہے وہ میری زندگانی لے گیا

●

گھر کے آنگن میں ننگے پاوں سفر
دھوپ کے بن میں چھاؤں چھاؤں سفر

●

مٹ گئی ریت کی صورت جو تھی خواہش اپنی
ریگ زاروں پہ بنائی تھی رہائش اپنی

●

ساگر ہم پی جائیں اب یہ کیسے ہو
صحرا صحرا پیاس میں رہنا کتنے دن

Scanned with CamScanner

میں ہوں مٹی دل کا گھروندا مٹی ہے
شیشے اور الماس میں رہنا کتنے دن

●

بے حاصلی کا یہ دکھ عفت زریں کے اشعار میں بہ حسن وخوبی پیش ہوا ہے۔انہوں نے زندگی سے تجربے حاصل کئے ہیں انہیں غزل کے رمز سے آشنا کر کے اپنا منفرد رنگ نکالا ہے۔ان کی تخلیقی فکر کا نیا پن انہیں نئے تلازمات اور پیکر تراشنے میں مدد دیتا ہے۔ان کی طرزِ ادا میں بھی نیا پن ہے کہ وہ روایتی رنگِ سخن سے الگ ہے۔ان کی شاعرانہ جدت پسندی انہیں تقلیدی بننے سے بچا لیتی ہے۔ان کی غزلوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نسائی فکر اپنے عصر سے مربوط ہے۔ان کے یہاں حکایتِ جاں بھی حکایتِ زمانہ بن گئی ہے۔

●●

Scanned with CamScanner

تاثرات

''بھنور بنتا ہوا دریا''

کے حوالے سے

کہکشاں تبسم کی زندگی کے جو کوائف میں نے جانے، سنے ہیں، جیسے گھرانے، معاشرے، سماج میں انہوں نے آنکھیں کھولی ہیں، پرورش پائی ہے، ہوش سنبھالے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات قطعیت کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ یہ ان کا ذاتی تجربہ نہیں ہے۔ آپ بیتی نہیں ہے اور اسی مقام پر آ کر ان کے شاعرانہ جوہر کھلتے ہیں، ان کی تیز نگاہی آشکارہ ہوتی ہے، ان کے قوتِ مشاہدہ کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے، ان کا مطالعاتی کھرا پن ظاہر ہوتا ہے۔ والد محترم قوس حمزہ پوری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ''شاعر بیشتر اوقات محض ناظم ہوتا ہے، فنکار ہوتا ہے، آرٹسٹ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے احساسات کی زبان بن جاتا ہے۔ وہ پرائے احساس کی یوں ترجمانی کرتا ہے کہ گویا وہ آپ بیتی ہو۔'' اور اسی مقام پر آ کر شاعر کا فنکارانہ جوہر کھلتا ہے۔ چنانچہ ہمیں تبسم صاحبہ کی قوتِ مشاہدہ کی ہی نہیں بلکہ دوسرے افراد سے، سماج سے، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے آگہی کی، دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے کی اور پھر اس کے فنکارانہ ترسیل کے سلیقے کی داد دینی چاہئے۔

Scanned with CamScanner

ہر چند محترمہ تبسم ہر دو اصناف پر قدرت کامل رکھتی ہیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ نظموں میں بہ نسبت غزل زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کے کلام میں رنگین لہر، نشیلی حدت، البیلی خوشبو، صف باندھے سائے، تپتی مسافت، ست رنگے سپنے، روتی حویلی، آسیبی موسم، یخ بستہ موسم، گیلی لکڑی وغیرہ وغیرہ بے شمار تلازمے، تشبیہات، استعارے اور تراکیبات موجود ہیں جو معنی کی دنیائے لامحدود کی سیر کراتے ہیں۔ جا بجا ہندی کے عام فہم الفاظ و تراکیب بھی انہوں نے بے دھڑک استعمال کر کے اپنے کھلے ذہن کا ثبوت تو مہیا کیا ہی ہے نئے ذائقے سے قاری کو محظوظ و مستفیض ہونے کا موقع بھی عطا کیا ہے۔

ناوک حمزہ پوری

●●

Scanned with CamScanner

بھاگل پور (بہار) سے تعلق رکھنے والی کہکشاں تبسم ایک گھریلو خاتون کی حیثیت سے اطمینان بخش زندگی بسر کر رہی ہیں۔امورِ خانہ داری کی مصروفیات کے باوجود ان پروفیسروں سے زیادہ مطالعے کے لیے وقت نکال لیتی ہیں، جنہیں حکومت صرف پڑھنے اور پڑھانے کی تنخواہ دیتی ہے۔انہوں نے بھاگل پور یونی ورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ ہندوستان کے مقتدر رسائل و جرائد میں ان کی نثری و شعری تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ 'بھنور بنتا ہوا دریا' ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔انہوں نے اردو غزل گو شاعرات پر نہایت وقیع کام کیا ہے اور ان کی یہ کتاب 'نسائی شعری آفاق' کے عنوان سے جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔ان کی زیرِ ترتیب کتابوں میں نظموں کا مجموعہ 'سلسلے سوالوں کے' اور غزلوں کا مجموعہ 'سفر باقی رہے' قابلِ ذکر ہیں۔

حقانی القاسمی

Scanned with CamScanner

NISAEE-SHERI-AAFAQ

51 SHAIRAAT-E-URDU KI GHAZALIYA SHAIRI KA TANQEEDI MUTALE'A

by

Kahkashan Tabassum

- کہکشاں تبسم کے کلام میں شعری تجربے اور آواز کی لہروں کی آمیزش کو دیکھتے ہوئے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ جدید شاعری میں ایک اور وژن جنم لے گا۔ یہ گہرے احساس اور گہرے جذبے کی شاعری ہے جو داخلی شعور (inner consciousness) کی بے داری کا احساس بخشتی ہے —— ایسے ہی شعری تجربے ذہن کو محبت اور 'ہیومنزم' کی جانب لے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن
- کہکشاں تبسم کے یہاں ایک خاص طرح کا سماجی سروکار نظر آتا ہے جو اگر ایک طرف اپنے اندر عالمی صورت حال کو سمیٹتا ہے تو دوسری طرف ان کی شخصیت سے بھی جدا نہیں ہوتا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی
- کہکشاں تبسم نسائی لہجہ کی شاعرہ ہیں۔ یہ وہ لہجہ ہے جسے مردنہ کلی طور پر محسوس کر سکتے ہیں نہ عمل میں لا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ذکی طارق
- آپ کی کتاب آپ کی شاعرانہ شخصیت کا بھرپور تعارف پیش کرتی ہے —— آپ کو شعر گوئی پر جیسی قدرت ہے اور شاعری سے جیسا شغف آپ کو ہے اس کے پیشِ نظر مجھے امید ہے کہ آپ شعر و ادب کے ساتھ سنجیدگی سے جڑی رہیں گی اور ہم عصر ادب سے اپنی وابستگی کا ثبوت دیتی رہیں گی۔ آپ کو ہم عصر ادب سے کسب بھی کرنا ہے اور اسے فیضیاب بھی۔ خورشید اکرم

Scanned with CamScanner